ساحل احمد

اقبال
کی
نظموں کا تجزیاتی مطالعہ

عقل و دل. ایک آرزو. شمع و شاعر. شکوہ.
والدہ مرحومہ کی یاد میں. خضر راہ. طلوع اسلام. مسجد قرطبہ.
طارق کی دعا. ذوق و شوق. ساقی نامہ. شعاع امید.
ابلیس کی مجلس شوریٰ.

اردو رائٹرس گلڈ، الہ آباد

اقبال کی نظموں کا تجزیاتی مطالعہ

اعلامیہ :

اُردو رائیٹرس گلڈ ایک علمی، ادبی اور ثقافتی ادارہ ہے جس کا مقصد نہ تو تجارت ہے اور نہ سیاسی بلکہ قومی یکجہتی اشتراک و عمل اور حسن و اخلاق کی روشنی پھیلانا ہے۔

سیکریٹری

اُردو رائیٹرس گلڈ۔ الہ آباد-۲

اقبال کی نظموں کا تجزیاتی مطالعہ

ساحل احمد

اُردو رائیٹرس گلڈ۔ الہ آباد۔۳

بار اوّل : ۱۹۸۲ تعداد : ۶۰۰
طابع : اسرار کریمی پریس الہ آباد قیمت : ۱۵ روپے
ناشر : اُردو رائیٹرس گلڈ۔ الہ آباد ۳

ترتیب

پیش لفظ	ساحل احمد	۷
1- عقل اور دل	وزیر آغا	۹
2- ایک آرزو	ملک حسن اختر	۱۲
3- شمع و شاعر	اسلوب احمد انصاری	۲۲
4- شکوہ	صدیق شبلی	۳۴
5- والدہ مرحومہ کی یاد میں	وقار عظیم	۴۱
6- خضر راہ	مسعود حسین خاں	۴۸
7- طلوع اسلام	حسن سجاد	۵۹
8- مسجد قرطبہ	مجتبیٰ حسین	۶۵
9- طارق کی دعا	مولانا ابوالحسن ندوی	۷۵
10- ذوق و شوق	صفی حیدر دانش	۸۰
11- ساقی نامہ	حسن جعفری	۸۶
12- شعاع امید	کلیم الدین احمد	۹۷
13- ابلیس کی مجلس شوریٰ	فتح محمد ملک	۱۰۱

متن

عقل اور دل : ۱۰۹

ایک آرزو : ۱۱۰

شمع و شاعر : ۱۱۱

شکوہ : ۱۱۶

والدہ مرحومہ کی یاد میں : ۱۲۳

خضر راہ : ۱۲۹

طلوع اسلام : ۱۳۶

مسجد قرطبہ : ۱۴۱

طارق کی دعا : ۱۴۸

ذوق و شوق : ۱۴۹

ساقی نامہ : ۱۵۳

شعاعِ امید : ۱۵۹

ابلیس کی مجلس شوریٰ : ۱۶۱

پیش لفظ

اقبال کی نظموں کا امتیازی حسن اس
جمالیاتی رویے سے متصف ہے جس
سے انسانی عظمت کو پر و بال بخشنے میں
اور فرد کو سوسائیٹی کے تسلط سے آزاد
کرانے میں مدد ملتی ہے۔ ان کی نظموں
میں خود اعتمادی اور خود شناسی کے
وہ جوہر موجود ہیں جن کے ذریعہ
فرد کی انفرادیت جلا پاتی ہے۔ انھوں
نے حصول خودی، عرفان و آگہی اور
تلاشِ ذات کے سلسلے سے خارج سے
داخل تک اور داخل سے خارج تک
جو دائروی سفر کیا وہ ان کے ذہنی و فنی

ارتقا کا آئینہ دار ہے۔ وہ اپنے سفر کے
مختلف مرحلوں میں حب وطن کے رشتے
سے، فرد اور سماج کے رشتے سے، آدمی
اور کائنات کے رشتے سے، ملک و ملّت
کے رشتے سے، مادہ اور روح کے رشتے سے
اور خودی و بے خودی کے رشتے سے لازوال
نظمیں تخلیق کی ہیں جن میں سے چند اس
کتاب میں موجود ہیں۔

ان نظموں کے تجزیاتی مطالعے ہندو
پاک کے بزرگ عالموں اور کچھ نوجوان
قلمکاروں کے زورِ قلم کا نتیجہ ہیں۔ جن
کے لئے میں ان کا ممنون و احسان مند
ہوں۔

توقع ہے کہ یہ کتاب طلبا کے لئے مفید
اور کارآمد ثابت ہوگی۔ اگر اس کتاب
کی ترتیب و تدوین میں کوئی کمی رہ گئی ہو
تو اس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔

۱۰ جنوری ۱۹۸۲ء

شامل احمد

وزیر آغا

عقل و دل

اقبال نے اپنے کلام میں عقل اور عشق میں جو رشتہ دریافت کیا ہے اسے سمجھنے کے لئے نظم "عقل و دل" ایک کلیدی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں نہ صرف عقل اور دل کے امتیازی اوصاف پر روشنی ڈالی گئی ہے بلکہ ان دونوں کے ربط باہم کو بھی اجاگر کر دیا گیا ہے۔ عقل کی لاف زنی دراصل مغرب کے اس انسان کی لاف زنی ہے جس نے عقلی انداز فکر کے ذریعہ سائنس اور ٹیکنالوجی میں بے اندازہ ترقی کی اور اس وہم میں مبتلا ہو کر وہ عقل کے ذریعہ اس کائنات کے جملہ رازہائے سربستہ کو فاش کر سکے گا۔ اس لاف زنی کا اظہار متعدد وعادی سے ہوا مثلاً عقل نے کہا کہ وہ رہنما ہے۔ پھر یہ کہ عقل ہی پر بھروسہ کر کے آدم خاکی نے آسمانی پنہائیوں میں جھانکا اور بہت سے راز معلوم کر لئے۔ علاوہ ازیں یہ بات کہ عقل مفسر ہستی ہے یعنی زندگی کے بیشتر مادی علوم عقل ہی کے رہین منت ہیں۔ بالخصوص مغرب میں طبیعات، علم الحیات، نفسیات، طب اور دوسرے شعبوں میں جو حیرت انگیز ترقی ہوئی۔ وہ عقل کے استقرائی اور سائنسی انداز ہی کے باعث تھی۔

چنانچہ جب اقبال نے اپنی نظم میں عقل کو اک کردار بنا کر پیش کیا تو یہ کردار دراصل مغرب کے

اس انسان ہی کے لئے ایک علامت تھا جس نے عقل و خرد کو واحد رہنما اصول کے طور پر تسلیم کر کے مادی دنیا پر اپنا تسلط قائم کر لیا تھا مگر اقبال کو اس بات کا بڑی شدت سے احساس تھا کہ مغرب کے انسان نے عقل کی کشت کو سیراب کرنے میں بڑی مستعدی دکھائی مگر اس نے اپنے گھر کے "پائیں باغ" کو فراموش کر دیا ہے۔ اس قدر کہ اب اسے یاد بھی نہیں کہ اس کا کوئی پائیں باغ تھا بھی کہ نہیں۔

اقبال کافی عرصہ یورپ میں رہے اور اپنے سامنے عقل کی اساس پر استوار ہونے والی تہذیب کو زوال آمادہ ہوتے اور اس تہذیب کے کارکنوں کو ایک عجیب سے نفسیاتی اور ذہنی خلفشار میں مبتلا دیکھتے رہے اور ہمہ وقت ان کے ذہن میں یہ خیال جڑیں پکڑتا رہا کہ مغرب کے انسان کے ذہنی عوارض کا علاج مغربی طب یا مغربی نفسیات کے بس کا روگ نہیں۔ بلکہ اس کا علاج فقط یہ ہے کہ مغرب والوں کو ان کے "پائیں باغ" کے وجود کا احساس دلایا جائے اور بتایا جائے کہ انھوں نے استقرائی یلغار میں ذات کے پورے منطقے سے صرفِ نظر کر لیا ہے۔ یہ نہیں کہ مغرب کے مفکرین اس بات سے آگاہ ہی نہیں تھے کہ ان میں برگساں اور ژنگ ایسے لوگ بھی تھے جو مادی ترقی کو روحانی بنجرپن کا باعث قرار دیتے تھے۔

برگساں عقل کے مقابلے میں وجدان کو اور ژنگ اجتماعی لاشعور کے حوالے سے "ذات" کو مجتمع کرنے پر زور دیتا رہا لیکن بحیثیت مجموعی مغرب کا انسان دل کی دنیا سے منقطع ہو چکا تھا۔ چنانچہ اقبال نے عقل کے مقابلے میں دل کو بطور ایک کردار پیش کیا اور پھر عقلی رویے کے مقابلے میں وہبی رویے کی یوں توضیح کی۔ کہ جہاں عقل کا کام سمجھنا اور پرکھنا، تجزیہ کرنا اور تعقلات قائم کرنا ہے۔ وہاں دل کا کام دیکھنا ہے یعنی سُنی سُنائی باتوں پر ایمان لانا نہیں بلکہ تجربے یا واردات سے گذرنا ہے۔ اسی بات کو ایک تشبیہ کے ذریعہ کمال خوبصورتی سے بیان بھی کیا۔ کہ عقل محفلِ

صداقت کی شمع ہے یعنی سچائی کی دریافت کے لئے وہ گہرے اندھیروں میں شمع بدست نکلتی ہے۔ دوسری طرف دل حسن کی بزم کا دیا ہے اور حُسن ہمیشہ نورانی متصور ہوا ہے۔ گویا دِل کا دیا حُسن کی روشنی کے ہالے میں اس طرح جگمگاتا ہے جیسے ماہ دو ہفتہ کے ہالے میں کوئی ستارہ! مراد یہ کہ ستارہ کی روشنی چاند کی بیکراں روشنی میں ضم ہونے کے باوجود اپنے وجود کو باقی رکھتی ہے۔ اسی طرح دِل حُسن کا نظارہ کرتے ہوئے اپنے وجود سے دستکش نہیں ہو جاتا۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ دل حسن کا نظارہ کرنے پر قادر ہے مگر یہ جرات رندانہ عقل کے بس کا روگ نہیں۔ اسی طرح علم کی انتہا بیتابی ہے اور بیتابی اس دکھ کا باعث ہے جو خواہشوں کے اژدہام سے پیدا ہوتا ہے مگر یہی سوچ یکتائی کی ان منازل تک لے جاتی ہے جہاں خواہشات کی بے قراری باقی نہیں رہتی۔

آخری یہ کہ عقل زمان و مکاں میں مقید ہے اور اس لئے مرورِ زماں کے بجائے وقت کے سلاسل میں جکڑی ہوئی ہے۔ جبکہ دل زمان و مکان سے ماوریٰ ہے۔ بلکہ وہ تو رب جلیل کا عرش ہے۔ مختصراً یہ کہ عقل کی تگ و تاز صرف ایک خاص حد تک ہے۔ اس مقام سے آگے عقل کے پر جلنے لگتے ہیں۔ مگر عشق کی جست بیکراں ہے اور وہ آنِ واحد میں ہر شے پر محیط ہو جاتا ہے ؎

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں

بظاہر اقبال نے اپنی نظم "عقل و دل" میں عشق کا ذکر نہیں کیا۔ مگر دل مزاجاً عشق کے جذبے ہی سے لیس ہوتا ہے۔ دل کا کام یہ ہے کہ وہ "حسن" کا ادراک کرے۔ مگر حسن تک رسائی پانے کے لئے خود دل کو ایک حرکی قوت بھی تو درکار ہے۔ عشق ہی وہ قوت ہے

جس سے لیس ہو کر دل "آزادی" حاصل کرتا ہے یعنی زمان و مکاں کی حد بندیوں سے اُوپر اٹھ کر حقیقت کی جھلک پانے میں کامیاب ہوتا ہے۔

بیشک اقبال کی اس نظم میں ابھی عشق بطور ایک کردار ظاہر نہیں ہوا مگر دل کے غرفے میں اس کی پرچھائیں ضرور نمودار ہو گئی ہیں۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو اقبال کی فکری جہت کا باقاعدہ آغاز ان کی نظم "عقل و دل" ہی سے ہوتا ہے۔ لہٰذا کلامِ اقبال میں یہ نظم ایک کلیدی حیثیت رکھتی ہے۔

ملک حسن اختر

ایک آرزو

ہر شاعر کے کلام کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد ہی ہم اس قابل ہوتے ہیں کہ اس کے کلام کی خصوصیات تک رسائی حاصل کر سکیں. اس کے لئے ہم کو اس کے ہر شعر، ہر غزل اور نظم کو گہری نظر سے دیکھنا پڑتا ہے تب گوہر مقصود ہاتھ لگتا ہے یہ بات بہت کم شاعروں میں پائی جاتی ہے کہ ان کی ایک نظم ان کے کسی خاص دور یا ان کی تمام خصوصیات کلام کی حامل ہو اقبال ہی ایک ایسا شاعر ہے جس کے کلام کے ہر دور کی امتیازی خصوصیات اس کی اس دور کی ایک مخصوص نظم میں نظر آتی ہیں چنانچہ ان کے دور اولیں کی نمایاں خصوصیات کی طرف ان کی نظم ایک آرزو میں واضح اشارے ملتے ہیں.

جیسا کہ ان کی نظم کے عنوان سے ظاہر ہے علامہ نے اس میں اپنی ایک آرزو کا ذکر کیا ہے ان کی یہ آرزو ان کے ابتدائی دور کے کلام کی خصوصیات کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے. اقبال جو کچھ محسوس کرتے سوچتے اور چاہتے ہیں اس کو نہایت ایمانداری اور صداقت سے اپنے کلام میں پیش کرتے ہیں. ان کے احساسات و خیالات الفاظ کا جامہ پہن کر اس طرح نمودار ہوتے ہیں کہ ہمیں اقبال کی شخصیت کے خطوط مرتب کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی. جذبہ اور

خلوص کی بے پناہ شدت ان کے اشعار کو تاثیر سے مملو کرتی ہے اور وہ شاعر کے احساسات و خیالات کے ترجمان بن جاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے محسوسات اور خارجی خیالات کے ردعمل نے ایک آرزو کی شکل اختیار کر لی ہے اور اس چھوٹی سی نظم میں ان کے ابتدائی کلام کی نمایاں خصوصیات ــــ جو بانگ درا کے صفحات پر بکھری پڑی ہیں سمٹ کر آ گئی ہیں۔

علامہ کے ابتدائی دور کی خصوصیات میں ان کی مناظر قدرت کے ساتھ جذباتی وابستگی حب وطن اور اس کے نتیجہ میں اپنے ہم وطنوں کی خدمت اور اہل وطن کے لئے دردمند دل بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ اقبال کے اس دور کے کلام کے سرسری مطالعہ سے جو چیز نمایاں نظر آتی ہے۔ وہ ہے ان کا استفہامی انداز، وہ اپنے گرد و پیش سے، چاند سے، سورج سے، ہمالہ سے، اور اپنے آپ سے سوال کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان سے اپنے درد کا درماں دریافت کرتے ہیں۔ ایک حیرت و استعجاب کی کیفیت ان پر چھائی رہتی ہے وہ اپنے ملک و قوم کی ناکامیوں کا علاج دریافت کرنے میں ناکام رہے ہیں، اگرچہ بعد میں ان کے کلام میں ملک و قوم کے کہنہ امراض کا علاج نظر آتا ہے جس نے ایک مربوط فلسفہ کی صورت اختیار کر لی ہے۔

اس لئے ایک خلش اور بے چینی ہے جس نے ان کے دردمند دل کو پریشان کر رکھا ہے وہ جب اپنے گرد و پیش پر نظر ڈالتے ہیں تو اپنے ہم وطنوں کی بے بسی کو دیکھ کر پریشان ہو جاتے ہیں اور چونکہ وہ اس کے اسباب و علل کا تجزیہ کر کے کوئی علاج دریافت نہیں کر سکے اس لئے کبھی ماضی کے اوراق کی ورق گردانی کرتے ہیں کہ شاید یہیں سکون قلب کا کوئی سامان ہو۔ چنانچہ ہمالہ سے کہتے ہیں ؎

اے ہمالہ داستاں اس وقت کی کوئی سُنا
مسکن آبائے انساں جب بنا دامن ترا

اور کبھی "گل رنگین" سے اس کے سینہ میں مستور راز کا پتہ چلانا چاہتے ہیں۔

سوز بانوں پر بھی خاموشی تجھے منظور ہے
راز وہ کیا ہے ترے سینے میں جو مستور ہے

اور پھر یکایک انھیں محسوس ہوتا ہے کہ یہ بھی منزل سے اتنا ہی دُور ہے جتنا کہ وہ خود:

میری صورت تو بھی اک برگ ریاض طور ہے
میں چمن سے دُور ہوں تو بھی چمن سے دور ہے

اور کبھی "خفتگان خاک" سے پوچھتے ہیں:

جستجو میں ہے وہاں بھی روح کو آرام کیا
واں بھی انساں ہے قتیل ذوق استفہام کیا

یہی حیرانی اور سرگردانی شاعر کو زندگی کے ہنگاموں سے فرار پر مجبور کرتی ہے اور وہ پکار اُٹھتا ہے۔

دنیا کی محفلوں سے اکتا گیا ہوں یارب
کیا لطف انجمن کا جب دِل ہی بجھ گیا ہو

چنانچہ وہ اپنے لئے ایک ایسی جگہ پسند کرتا ہے جہاں کہسار کا دلفریب نظارہ ہو، ندی کا شفاف پانی ہو، سبزہ نورستہ ہو، گُل ہو، بُلبل ہو، چڑیوں کے چہچہے ہوں، کتنا دلکش اور سہانا منظر ہے۔ جی چاہتا ہے ہم بھی شاعر کی طرح ایک ایسی دنیا بسالیں لیکن اقبال کا دردمند دل اسے کہاں چین لینے دیتا ہے۔ اس دنیا کے شور و شغب اور ہنگاموں سے دور رہ کر بھی حب وطن اور خدمت انسانی کا جذبہ ٹھنڈا نہیں پڑتا اور وہ کسی تھکے ہوئے مسافر کی اُمید کا آخری

سہارا بن جاتے ہیں۔

راتوں کو چلنے والے رہ جائیں تھک کے جس دم　　اُمید ان کی میرا ٹوٹا ہوا دیا ہو!
بجلی چمک کے ان کو کٹیا مری دکھا دے　　جب آسماں پہ ہر سو بادل گھرا ہوا ہو!

اس نظم میں اگر یہ اشعار موجود نہ ہوتے تو اعتراض پیدا ہو سکتا تھا کہ اقبال جو ہر وقت خدمت اہل وطن کا درس دیتا ہے۔ اس نظم میں اپنی ایک الگ تھلگ دنیا بسائے بیٹھا ہے جہاں کسی اور کا گذر ممکن نہیں۔ لیکن یہاں بھی اقبال کے دل میں کسی بھولے بھٹکے مسافر کی خدمت کا جذبہ کارفرما ہے۔ یہی نہیں بلکہ انسانوں سے دور رہ کر بھی اس کا حساس دل اپنے ہم وطنوں کی غفلت پر بیتاب ہے اور اپنے دل گداز نالوں سے انھیں خواب غفلت سے بیدار کرنا چاہتا ہے۔

اس خامشی میں جائیں اتنے بلند نالے　　تاروں کے قافلے کو میری صدا درا ہو
ہر دردمند دل کو رونا مرا رُلا دے　　بے ہوش جو پڑے ہیں شاید انھیں جگا دے

کون ہے جو نظم کے اس آخری شعر میں شاعر کے دل کی کسک کو محسوس نہ کرے اور درد و غم کے تاریک بادلوں کو جو اہل وطن کی مدہوشی، بے ہوشی اور بے عملی کی وجہ سے ان کے دل و دماغ پر چھائے ہوئے ہیں۔ نہ دیکھ سکے۔ وطن اور اہل وطن سے بے پناہ محبت مندرجہ بالا اشعار سے ظاہر ہے اس زمانے میں دوسرے شعراء رسمی طور پر وطن کی محبت کے گیت گا رہے تھے اور سوائے چکبست کے کسی شاعر نے بھی شدت جذبہ سے مغلوب ہو کر حب وطن کی نظمیں نہیں لکھیں۔ لیکن چکبست بھی ہندوؤں کے ماضی میں گم ہو جاتے ہیں۔ ان کا تخاطب صرف ہندو قوم سے ہے اور وہ ہندوؤں ہی کی مذہبی روایات کے ترانے گاتے ہیں اور ان میں وطن کی محبت کا جذبہ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ برخلاف اس کے اقبال کا تخاطب کسی

خاص فرقے یا قوم سے نہیں ان کی نظمیں ہر ایک کو متاثر کرتی ہیں۔ چاہے وہ ہندو ہو یا مسلمان، سکھ ہو یا عیسائی۔ اقبال جو کچھ محسوس کرتے ہیں اس کا گہرا تاثر لیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی نظموں میں بے پناہ تاثیر ہوتی ہے اور ناممکن ہے کہ کوئی پڑھے یا سنے اور متاثر نہ ہو۔ جب وطن کی بہترین عکاسی ان کی نظم "نیا شوالہ" کرتی ہے جس میں وہ دیر و حرم کی بجائے ایک نیا شوالہ بنانا چاہتے ہیں۔ اس نظم میں وہ دیر و حرم دونوں کا احسان اُٹھانے سے انکار کرتے ہیں اور ان کی جدت پسند طبیعت اپنے لئے ایک مخصوص راستہ تلاش کر لیتی ہے۔

کانوں پہ ہو نہ میرے دیر و حرم کا احساں — روزن ہی جھونپڑی کا مجھ کو سحر نما ہو
پھولوں کو آئے جس دم شبنم وضو کرانے — رونا مرا وضو ہو، نالہ مری دُعا ہو

یہ رونا اور آہ و زاریاں کس لئے ہیں اپنے ہموطنوں کے لئے جو خوابِ غفلت میں بیہوش پڑے ہیں اور شاعر انھیں اپنے نالہ و بکا سے ہوشیار کرنا چاہتا ہے۔ اس میں ہندو مسلمان کی تخصیص نہیں۔

حالی اور آزاد نے مناظرِ قدرت کی شاعری کی طرف لوگوں کی توجہ منعطف کرائی تھی اور اقبال کے زمانہ میں شعراء وطن کی محبت میں سرشار ہو کر مناظرِ قدرت پر نظمیں لکھ رہے تھے۔ مناظرِ قدرت میں سے علامہ کو پانی کی روانی سے خاص الفت ہے۔ اسی لئے ہمالہ والی نظم میں سب سے خوبصورت اور دلکش بند ندی کے بہتے ہوئے پانی ہی کے متعلق ہے ؎

آتی ہے ندی فراز کوہ سے گاتی ہوئی — کوثر و تسنیم کی موجوں کو شرماتی ہوئی
آئینہ سا شاہد قدرت کو دکھلاتی ہوئی — سنگ رہ سے گاہ بچتی گاہ ٹکراتی ہوئی

زیرِ مطالعہ نظم میں بھی اقبال نے مناظرِ فطرت سے اپنی وابستگی کا اظہار کیا ہے وہ اس دنیا کی شورشوں اور سازشوں سے الگ کہیں اپنا مسکن بنانا چاہتے ہیں۔ اور چونکہ انھیں قدرت کے حسین اور دلفریب نظاروں سے بے پناہ محبت ہے اس لئے وہ ایک ایسی وادی میں

رہنا پسند کرتے ہیں جہاں ؎

لذت سرود کی ہو چڑیوں کی چہچہوں میں
چشمے کی شورشوں میں باجا سا بج رہا ہو
گل کی کلی چٹک کر پیغام دے کسی کا
ساغر ذرا سا گویا مجھ کو جہاں نما ہو!
ہو ہاتھ کا سرہانا، سبزہ کا ہو بچھونا
شرمائے جس سے جلوت، خلوت میں وہ ادا ہو

صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہوں
ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو!

درختوں، پھولوں اور سبزہ کا تذکرہ کرتے کرتے وہ ندی کے "صاف پانی" کا ذکر شروع کر دیتے ہیں۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ علامہ کو دریا یا ندی کے بہتے ہوئے پانی سے ایک خاص لگاؤ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ندی کے پانی کا وہ سرسری تذکرہ کر کے نہیں گزر جاتے بلکہ اس چھوٹی سی نظم میں بھی تین شعر اور کہہ جاتے ہیں جو خوبصورتی اور دلکشی میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔

ہو دلفریب ایسا کہسار کا نظارہ
پانی بھی موج بن کر اٹھ اٹھ کے دیکھتا ہو
آغوش میں زمیں کی سویا ہوا ہو سبزہ
پھر پھر کے جھاڑیوں میں پانی چمک رہا ہو
پانی کو چھو رہی ہو جھک جھک کے گل کی ٹہنی
جیسے حسین کوئی آئینہ دیکھتا ہو!!

علامہ کو بہتے ہوئے پانی سے اتنی محبت اس لئے ہے کہ اس کی روانی عمل پیہم کا سبق دیتی ہے جو ان کے پیغام کا بڑا حصہ ہے اور خودی کے تصور کی ابتدائی شکل ہے اس کے بعد کے شعر میں شام کے وقت کا منظر کس حسن سے بیان کیا ہے۔

مہندی لگائے سورج جب شام کی دلہن کو
سُرخی لئے سنہری ہر پھول کی قبا ہو!

اقبال کی یہ نظم اس لحاظ سے بھی دورِ اولیں کی نمائندہ نظم ہے کہ اس دور میں اقبال

اپنی نظموں پر اکثر نظر ثانی فرماتے ہیں[1]۔ اور ان میں حک و اضافہ کر کے انھیں فنی اعتبار سے زیادہ خوبصورت بنانے پر اپنی توجہ صرف کرتے رہے۔ ایک آرزو ۱۹۰۲ء میں مخزن میں شائع ہوئی تھی اقبال نے بانگ درا کی اشاعت کے وقت اس پر بھی تنقیدی نظر ڈالی۔ شروع میں اس نظم کے دو بند تھے، انھوں نے نظر ثانی کے وقت دوسرا بند پورے کا پورا اور پہلے بند کے پانچ شعر حذف کر دیئے۔ پہلے بند کے مندرجہ ذیل شعر قلم زد ہوئے

پتوں کا نظارا میری کتاب خوانی
دفتر ہو معرفت کا جو گل کھلا ہوا ہو

یوں نا دیوں میں آ کر ٹھہرے شفق کی سرخی
جیسے کسی گلی میں کوئی شکستہ پا ہو!

پچھم کو جا رہا ہو کچھ اس طرح سے سورج
جیسے کوئی کسی کے دامن کو کھینچتا ہو

ظلمت جھلک رہی ہو کچھ اسطرح چاندنی میں
جوں آنکھ میں سحر کی سرمہ لگا ہوا ہو

دل کھول کر بہاؤں، اپنے وطن پہ آنسو
سرسبز جن کی نم سے بوٹا امید کا ہو

اور دوسرا بند یہ ہے۔

سمجھیں مرے سخن کو ہندوستاں والے
موزوں ہو گئے ہیں نالے سخن نہیں ہے

شمشاد گل کا بیری گل یاسمین کا دشمن
ہو آشیاں کے قابل یہ وہ چمن نہیں ہے

انہوں کو غیر سمجھوں اس سرزمیں میں رہ کر
میں بے وطن ہوں کوئی میرا وطن نہیں ہے

وہ مے نہیں کہ جس کی تاثیر تھی محبت
ساقی نہیں ہے باقی وہ انجمن نہیں ہے

در محفلے کہ یاراں شراب مدام کردند
چوں نوبتے بہ ماشد آتش بہ جام کردند!

ظاہر ہے کہ ان اشعار کے حذف کر دینے سے نظم کا مرتبہ بلند ہو گیا ہے۔ علامہ اقبال نے

---

[1] بانگ درا کی اکثر نظمیں اقبال کی نظر ثانی کی مرہون منت ہے۔

اپنی شاعری کے شروع میں ہی زبان و بیان بڑی توجہ دی ہے اور اپنی بات کو دلکش اور مؤثر انداز میں پیش کرنے کے لئے خوبصورت تشبیہوں اور استعاروں سے کام لیا ہے۔ اس نظم میں حسین تشبیہوں اور دلکش استعاروں سے کام لیا گیا ہے مثلاً سورج کا شام کی دلہن کو مہندی لگانا۔ گل کی ٹہنی کا جھک جھک کر پانی کو یوں چھونا جیسے کوئی آئینہ دیکھ رہا ہو، سبزے کا زمین کی آغوش میں سونا۔ گل کی کلی کا چٹک کر پیغام رسانی کرنا وغیرہ نادر تشبیہیں ہیں۔ اقبال نے تشبیہات اور استعارات کو استعمال کرتے ہوئے اس بات کا خاص خیال رکھا ہے کہ وہ موقع و محل کے مطابق ہوں اور اتنے بعید از قیاس نہ ہوں کہ قاری ان سے لطف اندوز نہ ہو سکے۔ وہ تو اپنے قرب و جوار کے حسین مناظر سے ہی تشبیہات حاصل کر لیتے ہیں تاکہ پڑھنے والا محظوظ بھی ہو اور آسانی سے ان کے پیچھے چھپے ہوئے معانی کو بھی تلاش کر لے۔ جوش اور روانی اقبال کے مزاج سے ہم آہنگ ہے۔ خلوت میں بیٹھ کر مالا جپتے رہنا ان کے مسلک کے خلاف ہے اس لئے جب وہ یہ آرزو کرتے ہیں کہ وہ دنیا کی محفلوں سے کنارہ کش ہو کر پہاڑ کے دامن میں الگ تھلگ زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں تو کچھ تعجب سا ہوتا ہے مگر یہ تعجب جلد ہی رفع ہو جاتا ہے کیونکہ وہ یہاں بھی قوم کی بھلائی کے نغمے گا رہے ہیں۔ ہر وقت لوگوں کو آرام پہونچانے اور راستہ دکھانے کا خیال ان پر مسلط رہتا ہے وہ بھولے بھٹکے مسافروں کے لئے رات بھر دیا جلائے رکھیں گے تاکہ ان کو راستہ تلاش کرنے میں آسانی ہو اور یہ کٹیا ان کے لئے پناہ گاہ بن جائے۔ کنج تنہائی میں بھی وہ اپنے دردناک نالوں سے قوم کو جگانا چاہتے ہیں اور دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ شروع میں ایسی جگہ رہنے کی تمنا ظاہر کرتے ہیں جو شورش سے دور ہو اور جہاں سکوت کی حکومت ہو وہ خامشی پر مرتے ہیں مگر جس جگہ وہ اپنا مسکن بناتے ہیں جب اس کی منظر نگاری کرتے ہیں تو وہ خاموشی سے کوسوں دور دکھائی

دیتی ہے وہاں چڑیوں کے چہچہے ہیں اور چشمے کی شورشوں میں باجا سا بج رہا ہے اور ظاہر ہے۔ اس شور میں کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی ہوگی۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ انسانوں کے ہنگاموں سے دور جانا چاہتے ہیں۔ مگر جب وہ آخر میں کہتے ہیں کہ:

اس خامشی میں جائیں اتنے بلند نالے
تاروں کے قافلے کو میری صدا درا ہو
ہر دردمند دل کو رونا مرا رُلا دے
بے ہوش جو پڑے ہیں شاید انھیں جگا دے

تو انسانوں کے وجود کا احساس بھی ہونے لگتا ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اقبال خواہش کے باوجود نہ تو دنیا سے کنارہ کر سکتے ہیں اور نہ سکوت، سکون اور خاموشی کی دنیا میں رہ سکتے ہیں۔ آگے چل کر ان کے مزاج کی اسی خصوصیت نے ان کو شاعرِ انقلاب اور عمل کا پیغامبر بنا دیا تھا۔

اسلوب احمد انصاری

"شمع و شاعر"

نظم کی فنّی ہیئت کی تشکیل کو وہ مکالمہ متعین کرتا ہے، جو شمع اور شاعر کے درمیان وقوع پذیر ہوا ہے۔ شاعر کا خطاب، جس سے نظم کا آغاز ہوتا ہے، مختصر ہے اور فارسی میں ہے اور اس کے بعد شمع کا جواب، جو طویل ہے اور اُردو میں ہے، نظم کے بقیہ حصے کا احاطہ کرتا ہے شمع اور شاعر کی حیثیت اس نظم میں دو کرداروں کی سی ہے، اور ان کی باہمی گفتگو کے وسیلے سے معروضیت کے عنصر کو ابھارنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ دونوں اردو غزل کی تاریخ میں بہت معروف علائم کی حیثیت سے مستعمل ہیں، اور اقبال نے انھیں اپنے مخصوص مقصد کے ابلاغ کے لئے برتا ہے۔ شمع ہماری شاعری میں بالعموم سوز و گداز، اندرونی جذبے کی تندی اور توانائی اور ایک نوع کی ہمہ گیر داخلیت (IN WARDNESS) کا اشاریہ سمجھی جاتی رہی ہے۔ اقبال نے انھیں عناصر کو اس سلسلے میں مرکزِ نگاہ بنایا ہے۔ شاعر اس کے برعکس اپنے اندر ان تمام محرکات کی غیر موجودگی کا احساس کرتا ہے، جو شمع کے وجودِ معنوی سے عبارت ہیں، اور اسے اس امر کا گہرا اور تکلیف دہ شعور ہے کہ اس کا تعلق اپنے خارجی ماحول اور اس کے مقتضیات سے منقطع ہو چکا ہے۔ شاعر کے اس احساسِ تنہائی کو خاص طور پر اُجاگر

کیا گیا ہے"۔ منزل ویران خویش" اور" چراغ لالۂ صحرا" جیسی ترکیبوں کے استعمال سے اس احساس کو ایک مرئی شکل دی گئی ہے۔ پھر یہ مصرعے بھی غور طلب ہیں۔

نے نصیبِ محفلے، نے قسمت کاشانۂ

در طوافِ شعلہ ام بالے نہ زد پروانۂ

برنمی خیزد ازیں محفل دلِ دیوانۂ

ان سب سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر اس بھری پری کائنات میں یک وتنہا ہے اور اس کے دنیوی جذبات اور داخلی زندگی میں شرکت کرنے والا اور کوئی ہم نفس موجود نہیں۔ چنانچہ اپنے بارے میں اس کا یہ اشارہ معنی خیز ہے۔

می طپد صد جلوہ در جانِ اہل فرسودِ من

لیکن اس کے باوجود اس کی اندرونی خلش اور اضطراب اس حد تک متعدی (INFECTIOUS) نہیں جیسا کہ شمع کا۔ شاعر کا شمع سے خطاب ایک علامتی تلاش ہے ذوق وشوق اور تپش وگداز کی نوعیت کو متعین کرنے کی، کیوں کہ یہ اس کی موضوعی شخصیت کے اجزائے ترکیبی ہیں۔ اسی لئے اس کی گفتگو کا اختتام اس شعر پہ ہوتا ہے۔

از کجا ایں آتشِ عالم فروز اندوختی؟

کرمکِ بے مایہ را سوزِ کلیم آموختی؟

یہ امر بہر صورت غور طلب ہے کہ شاعر کے اظہار بیان میں اس عنصر کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ جو شمع سے مختص اور اس کے اندر موجود ہے اور جس کی طرف وہ بار بار للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ اور شمع کے جواب میں ہمیں شاعر کے ماحول اور اس کے لوازمات کی تصویر جھلکتی نظر آتی ہے۔ شمع کا خطاب ایک طرح کے موازنے سے شروع ہوتا ہے، اور اس کی

بنیاد وہ عدم توافق ہے، جو شاعر کے ظاہری عمل اور حقیقت کے تقاضوں کے مابین موجود ہے اور اس سے ایک طرح کے اخلاقی خلاء کا احساس لازمی طور پر پیدا ہوتا ہے۔ خطاب کے پہلے حصے کا مرکزی نقطہ اور اس کا قلب یہی ہے۔

تو فرد زاں ہے کہ پروانوں کو ہو سودا ترا
شبنم افشاں تو کہ بزم گل میں ہو چرچا ترا
شعلہ ہے مثلِ چراغِ لالۂ صحرا ترا
انجمن پیاسی ہے اور پیمانہ بے صہبا ترا
زشت روئی سے تری آئینہ ہے رسوا ترا
کس قدر شوریدہ سر ہے شوق بے پروا ترا

ان سب مصرعوں میں انگشت نمائی کا احساس ملتا ہے، اور یہ انگشت نمائی ہے اس خلیج کی طرف جو ان توقعات کے، جو شاعر کی ذات سے وابستہ تھیں اور ناکامی کے اس احساس کے درمیان ہے، جو ان کے تشنۂ تکمیل رہ جانے کی وجہ سے دامن گیر ہے۔ شاعر کی شخصیت میں رہ رہ کر جس عنصر کا فقدان معلوم ہوتا ہے، وہ "لذتِ طوفاں" سے ناآشنائی ہے۔ بہ الفاظِ دیگر مہم جوئی کے جذبے اور اس چارہ گری (RESOURCEFULNESS) کی کمی، جو رکاوٹوں پر قابو پا کر حالات کو اپنے مفاد کے مطابق ڈھالنے پر آمادہ کرتی رہتی ہے:

اے دلِ تابندہ اے پروردۂ آغوشِ موج — لذتِ طوفاں سے ہے ناآشنا دریا ترا

آخری شعر میں جو اس طرح ہے:

اب نوا پیرا ہے کیا گلشن ہوا برہم ترا — بے محل تیرا ترنم، نغمہ بے موسم ترا

ہمیں یکلخت حالات کے دگرگوں ہو جانے کا احساس ہوتا ہے۔

یہ آخری شعر ایک نقطۂ انحراف ہے کیونکہ اس سے اگلے بند میں تمام تر توجہ ان خارجی حالات پر مرتکز معلوم ہوتی ہے جن پر شاعر کے جذبات اثر انداز ہوتے ہیں یا ہو سکتے ہیں۔ یہاں ساری گفتگو غزل کے رموز و علائم کے پردے میں کی گئی ہے۔ شاعر اور اس کے مخاطبین کے درمیان جو ربط و تعلق ہے، اسے اس طرح واضح کیا ہے:

آہ جب گلشن کی جمعیت پریشاں ہو چکی
پھول کو بادِ بہاری کا پیام آیا تو کیا

"بادِ بہاری کا پیام" استعارہ ہے اس نفسِ گرم کے لئے جو قوموں کے وجودِ باطنی میں ایک نئی روح کو بیدار کر دیتا ہے۔ "جمعیت کی پریشانی" کنایہ ہے انتشار اور نزاج کی ان قوتوں کے لئے جن کے آثار ہر سو نظروں کے سامنے موجود ہیں اور اس سے جو احساس شکست خوردگی پیدا ہو سکتا ہے، اسے اس طرح آشکارا کیا ہے:

پھول ہیں بے پروا، تو گرمِ نوا ہو یا نہ ہو
کارواں بے حس ہے آوازِ درا ہو یا نہ ہو

بنیادی علائم وہی ہیں جن سے اُردو شاعری کے رسیا بخوبی مانوس ہیں۔ کارواں اور آوازِ درا بھی انھیں میں شامل ہے۔ دونوں سے اقبال کو بغایت دلچسپی ہے اور ان دونوں سے ذہن سفر، نشاناتِ راہ اور بانگِ جرس کی طرف منتقل ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہی شیوۂ گفتار IDIUM لہجے کی کسی قدر تبدیلی کے ساتھ اگلے بند میں بھی نظر آتا ہے جو الفاظ اور تراکیب مرکزی اہمیت کی حامل ہیں، وہ ہیں سوز، رشتۂ الفت، شوقِ بے پروا، جگر سوزی اور شعلہ آشامی وغیرہ۔ یہ سب اصل موضوع سے اس حد تک مطابقت رکھتی ہیں کہ

ان کا وظیفہ ملتِ اجتماعیہ کو جرأتِ رندانہ پر آمادہ کرنا اور نیند کی گراں باری سے جھنجھوڑ کر جادۂ عمل پر گامزن ہونے کی ترغیب دلانا ہے۔

رو رہی ہے آج اک ٹوٹی ہوئی مینا اسے　　کل تلک گردش میں جس ساقی کے پیمانے رہے
آج ہیں خاموش وہ دشتِ جنوں پرور جہاں　　رقص میں لیلیٰ رہی، لیلیٰ کے دیوانے رہے

"ٹوٹی ہوئی مینا" کے رونے اور "دشتِ جنوں پرور" کی خاموشی کے وسیلے سے احساسِ ہزیمت اور مکمل انفعالیت کو ایک معروضی شکل دے دی گئی ہے۔ اس سے اگلا شعر ایک تضاد کو پیش کرتا ہے کیونکہ یہاں حقیقت کی ترجمانی محاکات کے ذریعہ کئے جانے کی بجائے بہت سریع الفہم انداز میں پیش کی گئی ہے جیسے اس شعر میں:

جن کے ہنگاموں سے تھے آباد ویرانے کبھی　　شہر ان کے مٹ گئے آبادیاں بن ہو گئیں

اسی طرح ایک اور شعر میں ایک تعمیم کو اس طرح نظم کر دیا ہے:

دہر میں عیشِ دوام آئیں کی پابندی سے ہے　　موج کو آزادیاں سامانِ شیون ہو گئیں

گو یہ ضرور ہے کہ پہلے مصرعے میں جو بات کہی گئی ہے، اسے دوسرے مصرعے میں ایک ذہنی تصویر کے ذریعے مجسم کر دیا گیا ہے۔ لیکن اس تصویر میں بھی ایک تجریدی رخ نمایاں ہے۔ جو "سامانِ شیون" کی ترکیب سے آشکار ہے۔ البتہ وہ استعاراتی شیوۂ تکلم بھی بعض جگہ توجہ کو اپنی جانب کھینچتا ہے جس کا ایک ہلکا سا پرتو شروع کے بندوں میں دکھائی دیتا ہے۔ اور چند لمحوں کے لئے ہمیں چونکا دیتا ہے۔

خود تجلی کو تمنا جن کے نظاروں کی تھی　　وہ نگاہیں نا امیدِ نورِ ایمن ہو گئیں
وسعتِ گردوں میں تھی ان کی تڑپ نظارہ سوز　　بجلیاں آسودۂ دامانِ خرمن ہو گئیں
دیدۂ خونبار ہو منت کشِ گلزار کیوں　　اشکِ پیہم سے نگاہیں گل بدامن ہو گئیں

پہلے شعر کے دونوں مصرعوں میں تجلی اور نور کا شعری پیکر استعمال کیا گیا ہے۔ دوسرے شعر میں بھی تڑپ کے نظارہ سوز ہونے اور بجلیوں کی آسودگی میں مخفی (IMPLICIT) طور پر یہی دونوں پیکر دوبارہ لائے گئے ہیں، اور اس طرح ان کی تجدید کی گئی ہے۔ پہلے اور دوسرے شعر کے دونوں آخری مصرعوں میں ہزیمت اور شکست خوردگی کا احساس واضح طور پر موجود ہے اور یہ پہلے مصرعوں کے باہم متضاد ہونے کی وجہ سے اور نمایاں ہو گیا ہے۔ تیسرے شعر میں "دیدۂ خونبار" کو گلزار کے جھلس جانے کی وجہ سے اس کا رہینِ منت ہونے کی حاجت نہیں۔ کیونکہ اشکوں کے پیہم سیلاب نے اس کے دامن کو داغدار بنا دیا ہے"۔ "دیدۂ خونبار" اور "گل بدامن" دونوں میں رنگ کا شعری پیکر مشترک ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اشک پیہم بھی خون ہی کے آنسو ہیں۔ اگلا شعر جمالیاتی اعتبار سے بہت دل کش ہے۔

نغمہ پیرا ہو، کہ یہ ہنگامِ خاموشی نہیں
ہے سحر کا آسماں خورشید سے مینا بدوش

"سحر کے آسمان" کا خورشید سے مینا بدوش ہونا، فطری کائنات میں تخلیقِ نو کے سیلاب کے اُمنڈ پڑنے کا استعارہ ہے۔ اس بیداری کے عرفان کے لئے آنکھ اور دل دونوں کی مکمل آسودگی ضروری ہے۔ آنکھ کی سرشاری جلوؤں کی فراوانی، تنوع اور رنگا رنگی پر منحصر ہے اور قلب کے لئے "سوزِ جوہر گفتار" صیقل کے مانند ہے:

آنکھ کو بیدار کر دے وعدۂ دیدار سے
زندہ کر دے دِل کو سوزِ جوہر گفتار سے

اس بند کے بعد جس میں بظاہر امید اور رجائیت کی ایک دزدیدہ کرن نظر آتی ہے۔ ہم پھر ٹھوس اور تلخ حقائق کی طرف لوٹ آتے ہیں۔ یہاں شمع خاص طور سے دو خامیوں کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اول ذوقِ تن آسانی اور دوسرے احساس جمیت کا فقدان یعنی

اپنے محدود نفس کے زندان میں گرفتار رہنا۔ ان دونوں کا مرجع ہندوستان کے مسلمان ہیں۔
اول الذکر منتج ہوتا ہے اندرونی صلاحیتوں کے سمٹنے اور سکڑنے پر۔

بحر تھا صحرا میں تو گلشن میں مثلِ جو ہوا

اور تقدیر کی صورت گری کرنے اور ستاروں پر کمند ڈالنے کی بجائے حالات کے سامنے سپر انداز ہونے پر، اور احساسِ جمعیت کے مضمحل ہو جانے سے پراگندگی، انتشار اور لامقصدیت لازمی طور پر ملّی زندگی میں داخل ہو جاتے ہیں۔

چھوڑ کر گل کو پریشاں کاروانِ بو ہوا

اس بند کے آخری سے پہلے شعر میں ایک طرح کا براہ راست بیان ملتا ہے لیکن جس شعر پر بند کا خاتمہ ہوتا ہے اس میں احساسِ جمعیت کے فقدان کو پھر شاعرانہ اندازِ بیان کے سہارے موج اور بحر کے ربط باہمی کے آئینے میں نمایاں کیا گیا ہے۔ اس قسم کی ذہنی تصویریں جو تخیل کی مہمیز کرتی ہیں، اقبال کی شاعری میں تواتر کے ساتھ ملتی ہیں اور معنی و مفہوم کی تہوں کو جلا بخشتی ہیں۔ مثال کے طور پر یہ تصویر دیکھئے:

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

اس سے اگلے بند میں اپنی قوتوں کی شیرازہ بندی کرنے اور انھیں تعمیری ضرورتوں کے لئے تصرف میں لانے پر مسلسل زور ملتا ہے یعنی تخریب کے بطن سے تعمیرِ نو کا سامان پیدا کرنا، ناکامیوں کو امید اور کامرانی سے ہمکنار کرنا اور اس پورے نظام کو جو ہلاکت اور انہدام کے دہانے پر کھڑا ہے، ایک نئی جہت، ایک نئی سمت اور ایک نئے افق سے آشنا کرنا:

پردۂ دل میں محبت کو ابھی مستور رکھ
یعنی اپنی مے کو رسوا صورتِ مینا نہ کر

شکست و ریخت اور انتشار و افتراق سے اُبھر کر مثبت اور تخلیقی طور پر اپنی قوتوں کی بازآفرینی اور شیرازہ بندی کی دعوت، جو عقیدے اور عمل دونوں میں صلابت اور استحکام پیدا کرے استعاراتی زبان میں اس طرح دی ہے :

شمع کو بھی ہو ذرا معلوم انجامِ ستم — صرفِ تعمیرِ سحر خاکستر پروانہ کر
تو اگر خود دار ہے منت کشِ ساقی نہ ہو — عینِ دریا میں حباب آسا نگوں پیمانہ کر

اپنے عزائم کے لئے نئی جولانگہ طلب کرنے اور نئی فضاؤں میں آشیاں سازی کا ارادہ کرنے کی طرف اشارہ اس مصرعے میں موجود ہے :

ہے جنوں تیرا نیا، پیدا نیا ویرانہ کر!

البتہ اگلے شعر کا ایک مصرع خاصا سپاٹ اور بے رس معلوم ہوتا ہے، اور یہ ان تمام بندوں کی ترتیب و تنظیم اور ان کے مخصوص محاورے (IDIOM) کے درمیان ایک اجنبی عنصر کی طرح کھٹکتا ہے :

تو عصا افتاد سے پیدا مثالِ دانہ کر

اس کی ہیئت ترکیبی میں بھی ایک تعقید راہ پائی گئی ہے لیکن بند کے آخری شعر :

کیوں چمن میں مثلِ رمِ شبنم ہے تو؟
لب کشا ہو جا سرودِ بربطِ عالم ہے تو

اس سے مختلف ہے۔ یہاں "رمِ شبنم" اور "سرودِ بربطِ عالم" کے درمیان گہرے تضاد سے کام لیا گیا ہے۔ "رمِ شبنم" اشارہ ہے بے ثباتی کا اور تحلیل ہو جانے کا اور "سرود بربطِ عالم" منتشر ہو کر نفوذ کر جانے کا۔ پہلے مصرعے میں خاموشی اور دوسرے میں آواز کا شعری پیکر قابلِ توجہ اور باعثِ کشش ہیں لیکن یہ خاموشی تخلیق کا رمز نہیں، بلکہ نیستی کی علامت ہے۔

اور آواز خطابت، ابلاغ اور ترسیل کا ذریعہ ہے۔ آواز کا تفاعل (FUNCTION) قدیم زمانے سے تخلیقی مانا گیا ہے۔ "سرود بربط عالم" سے ذہن ہم آہنگی، نظم اور توازن کی طرف بھی منتقل ہوتا ہے اور بند کے بالکل آخر میں اس شعر کے لانے سے مقصود ان تصورات کا تکملہ ہے، جن سے نظم کا آغاز ہوا تھا اور اس طرح آغاز اور انجام ایک دوسرے سے منسلک ہو گئے ہیں۔

اگلے بند کا پہلا مصرع:

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرا

ضرورت سے زیادہ برہنہ ہونے کے سبب مذاق سلیم پر گراں گذرتا ہے۔ کیوں کہ یہ ایک طرح کی موعظت (EXHORTATION) کے مماثل ہے۔ اس بند کے تمام اشعار میں اس بدیہی پن (EXPLICITNESS) کو شعری بے ساختگی کے ذریعہ ہموار، زود ہضم اور سہل بنانے کی کوشش نظر نہیں آتی۔ اس کے برعکس یہاں ایک طرح کا شعوری احترام وانصرام ملتا ہے، جو ذیل کے مصرعوں میں عیب کی حد تک نمایاں ہو گیا ہے:

دانہ تو، کھیتی بھی تو، باراں بھی تو، حاصل بھی تو

راہ تو، رہرو بھی تو، رہبر بھی تو، منزل بھی تو

ناخدا تو، بحر تو، کشتی بھی تو، ساحل بھی تو

قیس تو، لیلیٰ بھی تو، صحرا بھی تو، محمل بھی تو

مے بھی تو، مینا بھی تو، صہبا بھی تو، محمل بھی تو

اس انداز بیان میں رعایتِ لفظی کا ضرورت سے زیادہ عمل دخل نظر آتا ہے، اور الفاظ کی اندرونی، تخلیقی صلاحیتوں سے عمداً صرف نظر کرتے ہوئے ان کے محدود اور پامال مفہوم ہی سے واسطہ رکھا گیا ہے۔ ہر کیفیت کے لوازمات کو گنگنانے سے ایک طرح کی اکتاہٹ دینے والی

یکسانیت ان مصرعوں میں راہ پا گئی ہے جو شعری ردعمل کی پیچیدگی اور تاثیر کی نفی کر رہی ہے۔
آخری شعر میں بھی ایک طرح کا براہ راست اور قطعی بیان ملتا ہے۔

بے خبر تو جوہرِ آئینۂ ایام ہے　　تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

اگلے بند کے پہلے شعر کا پہلا مصرع پچھلے بند کے پہلے شعر کے پہلے مصرع سے حیرت انگیز طور پر ہم آہنگ معلوم ہوتا ہے، اور یہ ہم آہنگی شعوری سی لگتی ہے۔

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تو

اس بند میں تمام تر زور اس احساس کے تازہ کرنے پر ہے کہ مخاطب بے پناہ مستتر قوتوں کا مالک اور امین ہے۔ اور مستقبل میں کامیابی کا دارومدار اس کی خود شناسی اور خود آگاہی اور ان قوتوں کو صحیح طور سے بروئے کار لانے پر ہے۔ فی الحال وہ ایک طرح کے احساسِ کمتری میں مبتلا ہے۔ وہ یہ بھول چکا ہے کہ اس کا ماضی کتنا تابناک اور درخشاں رہا ہے اور مستقبل کتنے لامحدود اور روشن امکانات کا حامل اور اس کے لئے چشم براہ ہے۔ وہ یقیناً اپنی تقدیر کی صورت گری پر قادر ہے۔ بشرطیکہ وہ عمل کی چنگاری کو اپنے اندر بھڑکا سکے۔

قطرہ ہے لیکن شاملِ بحرِ بے پایاں بھی ہے
دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکتِ طوفاں بھی ہے

سینہ ہے تیرا امیں اس کے پیامِ ناز کا
جو نظامِ دہر میں پیدا بھی ہے پنہاں بھی ہے

اس بند میں مندرجہ شعر بیت الغزل کی حیثیت رکھتا ہے، اور بالعموم زبانوں پر چڑھا ہوا ہے۔

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا　　ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی ہے

یہاں پھر اس کوشش کا اعادہ نظر آتا ہے کہ مخاطب کو عمل پر آمادہ کیا جائے، اسے خنودگی کے

عالم سے جھنجھوڑ کر نکالا جائے، اور اس کے اندر سوز و گداز کے محرک کو تازہ کیا جائے تاکہ وہ زندگی کی جد و جہد میں اپنا وظیفۂ خاص ادا کر سکے لیکن یہاں انداز تبلیغ کا نہیں، ترغیب کا ہے۔ اور یہ ترغیب بھی محض تعلیمات کو نظم کر دینے کے ذریعے نہیں دلائی گئی ہے، بلکہ شعری انداز کو کام میں لاکر اور خود ترغیب دلانے والے کو ان جلوؤں پر جو اس کے آئینۂ ادراک میں منعکس ہیں، پورا بھروسہ ہے۔

راز اس آتش نوائی کا مرے سینے میں دیکھ　　جلوۂ تقدیر میرے دل کے آئینے میں دیکھ

اس پورے بند کو ایک طرح کی رومانی یاد آوری (NOSTALGIA) کہہ کر نہیں ٹالا جا سکتا، کیونکہ اس کے پسِ پشت بلوغتِ فکر بھی ہے اور ایک طرح کی شعری منطق بھی۔

آخری بند میں ایک طرح کی بشارت ملتی ہے، اور یہ بشارت ہے ایک روشن صبح کے طلوع ہونے کی، اور ان تمناؤں کے بار آور ہونے کی جو دل کی گہرائیوں میں عرصے سے مچل رہی تھیں، اور اب اظہار کے لیے بیتاب ہیں:

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش　　اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی

نور اور وہ بھی آئینہ پوش، جس میں اشارہ پوشیدہ ہے محیط ہونے اور ہر طرف سے مرکزی نقطے کی طرف بڑھنے اور پھیلنے کا۔ ظلمت نور کا تضاد پیش کرتی ہے، اور اس کی سیماب پائی اس کے زائل ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ اس کیفیت کے تسلسل کا یہ عالم ہوگا۔

اس قدر ہوگی ترنم آفریں بادِ بہار
نکہتِ خوابیدہ غنچے کی نوا ہو جائے گی

یادِ بہاری کی ترنم آفرینی اس درجے نشاط انگیز اور روح پرور ہے کہ اس کے زیرِ اثر غنچے کی نکہت خوابیدہ نوا بن جائے گی یعنی خوشبو، جس کا تعلق قوتِ شامہ سے ہے،

ایک سماعی (AUDITORY) پیکر میں ڈھل جائے گی، اور جیسا کہ اس سے پہلے بھی اشارہ کیا گیا، آواز کو بصارت یا حسِ شامہ پر ایک طرح کی تقدیم حاصل ہے۔ شمع نے آغازِ کار میں شاعر کو سوز و ساز کی کمی کا طعنہ دیا تھا، لیکن اب یہ کمی شاید محسوس نہ ہو، کیونکہ یہ سوز و ساز یہ حرارت اور برانگیختگی، جو خوابوں اور خواہشوں کو حقیقت میں تبدیل کرنے کے لئے ضروری ہے، ہر شے میں سرایت کر چکی ہو گی۔

شبنم افشانی مری پیدا کرے گی سوز و ساز
اس چمن کی ہر کلی درد آشنا ہو جائے گی

اس کے برعکس وہ لوگ جو اوّل عا اور خود نمائی میں پیش پیش رہتے ہیں، اور جنھوں نے اعتدال اور میانہ روی کا راستہ ترک کر دیا ہے، وہ اسکے نتائج اور عواقب اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔

دیکھ لو گے سطوتِ رفتارِ دریا کا مآل موج مضطر ہی اسے زنجیر پا ہو جائیگی

اس کیفیت کے منقلب ہو جانے کی ایک اور شکل تخیل کے روبرو آتی ہے:

نالۂ صیاد سے ہوں گے نوا ساماں طیور
خونِ گلچیں سے کلی رنگیں قبا ہو جائے گی

ان اچانک تبدیلیوں کی تعداد اتنی ان گنت اور ان کی رفتار اتنی پے بہ پے ہے کہ انھیں گرفت میں لانا امکان سے باہر نظر آتا ہے:

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائیگی

آخری استعارے کی بنیاد پھر وہی وجدان ہے یعنی رات کی تاریکی کا مٹ جانا اور دن بھر کے بھرپور اُجالے کا اس پر غالب آجانا۔ توحید کا غلغلہ جو نور کی فراوانی سے منسلک اور متعلق ہے۔ تمام دوسرے اعلاناتِ آزادہ روی پر فوقیت رکھے گا:

شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے

صدیق شبلی

شکوہ

علامہ اقبال کی نظم شکوہ مشرقی ادب کا ایک عظیم شاہکار ہے۔ مہر و محبت کی طرح شکوہ و شکایت کا بیان بھی شاعری میں اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ اس کا تعلق بھی انسانی فطرت سے بہت گہرا ہے۔ اور شاعری فطرت انسانی کے اس پہلو سے بے تعلق نہیں رہ سکتی عربی شعراء کے ہاں شکوہ کے مضامین اشعار یا منظومات کی صورت میں مل جاتے ہیں لیکن فارسی اور اردو شاعری میں تو اس مقصد کے لئے ایک مستقل صنفِ سخن واسوخت کے نام سے موجود ہے واسوخت غزل کا نقطۂ مخالف ہے اور اس میں شاعر محبوب کو اپنی محبت کا یقین دلاتا ہے اور اس سے اس کی بے التفاتی اور بے وفائی کا شکوہ کرتا ہے۔

عبدالقادر نے اقبال کے شکوے کو ایک قسم کا اجتماعی واسوخت قرار دیا ہے جس میں شاعر نے خدا سے اسی طرح گلے شکوے کئے ہیں جس طرح واسوخت میں عاشق اپنے محبوب سے کرتا ہے۔ لیکن حق بات تو یہ ہے کہ یہ نظم واسوخت سے متاثر ہوتے ہوئے بھی اس قسم کی نظموں سے بہت بلند ہے۔ کہاں انفرادی جذبات کا بے باکانہ بیان اور کہاں اجتماعی مقصد پسندی کے سانچے میں ڈھلی ہوئی یہ نظم جس کا مخاطب خدا ہو۔ جس طرح اقبال کا ساقی نامہ دوسرے

ساقی نامہ سے قابل موازنہ نہیں۔ اسی طرح اس شکوے کا مقابلہ کسی دوسرے سے کرنا بھی درست معلوم نہیں ہوتا۔

خدا سے شکوے کے نمونے بھی فارسی اردو شعرا کے ہاں مل جاتے ہیں۔ اس موضوع پر حافظ خیام نے بڑے دلکش شعر کہے ہیں۔ اُردو کے بعض شاعروں کو بھی یہ مضمون پسند رہا ہے۔ لیکن اقبال کے شکوے کے سامنے ان کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اکثر و بیشتر شعراء نے محض تفنن طبع اور شوخیٔ بیان کے لئے یہ مضمون باندھا ہے۔ اُردو شعراء میں غالب نے البتہ اس موضوع پر زیادہ توجہ صرف کی ہے لیکن غالب کی شاعری میں شکوے کا مضمون منفرد تو ہے لیکن کہیں کہیں مابعد الطبیعیاتی ہو جاتا ہے جبکہ اقبال کا شکوہ اجتماعی چیز ہے اور یہ شکوہ پورے سماجی اور سیاسی پس منظر کو پیش کرتا ہے۔

شکوے کا موضوع ملت اسلامیہ کا عروج و زوال ہی ہے۔ بہت سے اُردو شاعروں نے مسلمانوں کی عظمت رفتہ پر چھوٹی بڑی نظمیں لکھی ہیں۔ اس سلسلہ میں مسدس حالی خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ حالی کی اس نظم کو بڑی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔ مسدس کی تاثیر اپنی جگہ مسلم ہے لیکن مسدس کے پڑھنے سے طبیعت میں افسردگی پیدا ہوتی ہے جبکہ علامہ اقبال نے شکوہ میں مسلمانوں کے شاندار ماضی کی تصویر کشی اس پر شکوہ انداز میں کی ہے کہ اس نظم کو پڑھ کر فخر و اعتماد کا احساس پیدا ہوتا ہے اور حرکت و عمل کی تحریک ہوتی ہے۔

اقبال نے اپنی یہ شاہکار نظم 1911ء میں یورپ سے واپسی کے تین سال بعد لکھی۔ یورپ کا قیام علامہ کے ذہنی ارتقاء میں ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اقبال اس زمانے میں وہاں گئے۔ جب دنیا کا ایک بڑا حصہ مغربی اقوام کی سیاسی و ثقافتی یلغار کا شکار ہو چکا تھا۔ سب کو اس تہذیب نے مرعوب کر رکھا تھا لیکن اقبال کی توانا شخصیت نے سیلاب مغرب کے

مقابلے میں بڑی استقامت دکھائی۔ اقبال نے اس تہذیب کے عین عروج کے زمانے میں اس کی کمزوریوں کو بے نقاب کیا اور اس کے زوال کی پیش گوئی کی۔ بہرحال یورپ کے قیام نے انھیں قوموں کے عروج و زوال پر غور کرنے کا موقع فراہم کیا۔

یورپین اقوام کی ترقی، تسلط اور خوش حالی نے انھیں ملتِ اسلامیہ کی سیاسی ابتری معاشی بدحالی اور معاشرتی پستی کی طرف متوجہ کیا۔ شکوے میں اقبال کے اس ردِعمل کا عنصر غالب نظر آتا ہے۔ لوگ یورپ گئے تو اپنے آپ کو وہاں کھو آئے۔ لیکن اقبال وہاں سے اس طرح لوٹے کہ ان کی تمام سرگذشت کھوئے ہوؤں کی جستجو بن گئی اور وہ عمر بھر اپنی قوم کی ناقۂ بے لگام کو سوئے قطار کھینچتے رہے۔

اقبال کی یہ نظم ارباب وفا کا شکوہ اور خوگر حمد کا خدا سے گلہ ہے۔ حکیم الامت اپنے موضوع کی نزاکتوں سے پوری طرح آگاہ ہیں۔ اس لئے انھوں نے شکوے کا آغاز مناسب عذر معذرت کے ساتھ کیا ہے۔ ملت کے بارے میں احساسِ زیاں انھیں فکر فردا پر اور تاب سخن انھیں شکوے پر مجبور کرتی ہے۔ وہ ع

شکوہ اللہ سے خاکم بدہن ہے مجھ کو

کہہ کر اس سلسلہ کی ابتدا کرتے ہیں۔ اس مختصر لیکن مؤثر تمہید کے بعد مسلمانوں کی اسلام کے لئے خدمات اور راہ خدا میں ان کی قربانیوں کا تذکرہ ہے۔ اس حصہ میں واقعات کا بیان تفصیلی ہے نہ سلسلہ وار۔ اقبال نے تاریخ اسلام سے کچھ اشارات لے کر مسلمانوں کی جاں بازی اور سرفروشی کا مرقع بڑی ہنرمندی سے مرتب کیا ہے۔ واقعات کے اس انتخاب میں وہ تمام جزئیات آگئی ہیں۔ جو اس مرقعے کو پرکشش اور پراثر بنا سکتی تھیں۔ توحید۔ اسلام کا اصل اصول ہے۔ مسلمانوں نے تبلیغ توحید کے لئے جو جہاد کیا اقبال نے اس کی روداد بڑی خوبی سے قلمبند کی۔

دوسری اقوام کے مقابلے میں مسلمان اس میدان میں زیادہ سرگرم عمل رہے۔ انھوں نے افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں اور یورپ کے کلیساؤں میں اذانیں دیں۔ آتشکدہ ایران کو ٹھنڈا کیا اور تذکرۂ یزداں کو زندہ کیا۔ بحرِ ظلمات میں گھوڑے دوڑائے۔ یہ سب کچھ انھوں نے خدا کی خوشنودی کے لئے کیا۔ اقبال نے اس جدوجہد اور اس کے مقاصد کو شکوے میں اس طرح بیان کیا ہے ؎

ہم جو جیتے تھے تو جنگوں کی مصیبت کے لئے
اور مرتے تھے ترے نام کی عظمت کے لئے

تھی نہ کچھ تیغ زنی اپنی حکومت کے لئے
سر بکف پھرتے تھے کیا دہر میں دولت کے لئے

قوم اپنی جو زر و مالِ جہاں پہ مرتی
بت فروشی کے عوض بت شکنی کیوں کرتی

شکوے کا شمار اگرچہ اقبال کی ابتدائی نظموں میں ہوتا ہے لیکن یہ نظم اپنی جگہ ایک منفرد مقام رکھتی ہے۔ ایک اسلامی شاعر کی حیثیت سے اقبال کی شہرت میں اس نظم کا بڑا حصہ ہے۔ اس نظم میں فکرِ اقبال کے بعض اہم پہلو سامنے آتے ہیں۔ جن پر بعد میں اقبال نے بہت زور دیا۔ اسے اقبال کی عظیم نظموں کا مقدمہ کہا جا سکتا ہے۔ اس نظم سے اقبال کے نظریہ قومیت پر مزید روشنی پڑتی ہے کہ ان کے نظامِ فکر میں جغرافیائی یا نسلی قومیت کی گنجائش موجود نہیں ہے۔

اقبال نے اس نظم میں خدا سے شکوہ کر کے بڑی جرأت کا ثبوت دیا ہے۔ اس کام کے لئے وہی شخص میدان میں آ سکتا ہے جس کی خودی مستحکم ہو۔ اس مستحکم خودی کے باوجود علامہ نے اس نظم میں اپنی ملت کی ترجمانی کر کے اپنے فلسفۂ بے خودی کی جھلک دکھائی ہے۔

شکوے کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ اس کے تراجم دنیا کی کئی زبانوں میں ہو چکے ہیں۔

شکوے کی بات جواب شکوہ کا ذکر کئے بغیر ادھوری رہتی ہے۔ کہتے ہیں کہ شکوہ اقبال نے

کہا مگر جواب شکوہ ان سے کہلوایا گیا۔ شکوے میں بعض جگہ ان کا لہجہ زیادہ بیباک ہوگیا تھا۔ اس سے بعض حلقوں میں ان کے بارے میں غلط فہمی پیدا ہوگئی تھی۔ اسے دور کرنے کے لئے انھوں نے جواب شکوہ لکھا۔ ممکن ہے یہ بات درست ہو۔ لیکن دونوں نظموں کو دیکھ کر اب تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ اقبال مسلمانوں کو ان کی پستی اور اس کے اسباب سے آگاہ کرکے انھیں اس گڑھے سے نکالنا چاہتے تھے۔ اس کے لئے انھوں نے شکوہ اور جواب کی دلچسپ تکنیک استعمال کی دونوں نظموں میں مسائل کا بیان بھی ہے اور ان کا حل بھی اگر وہ یہ تکنیک استعمال نہ کرتے تو شاید یہ نظم اتنا بڑا شاہکار نہ بن پاتی اور محض نصیحتوں کا انبار بن کر رہ جاتی۔ مسلمانوں کے کارناموں کی تصویر ان کی زبوں حالی کی تصویر سے روشن ہے۔ اس کے علاوہ نظم کے دعائیہ اختتام سے مایوسی کی بجائے اعتماد اور یقین کا احساس ابھرتا ہے۔ اقبال مسلمانوں کے مستقبل کے بارے میں پرامید نظر آتے ہیں اور فرماتے ہیں ؎

اے خوش آں روز کہ آئی و بصد ناز آئی
بے حجابانہ سوئے محفل ما باز آئی

ملت اسلامیہ کا گلشن اگرچہ اجڑ چکا تھا۔ لیکن اقبال اس کے بلبل تنہا تھے۔ جو امید بہار میں محو ترنم رہے اور اپنے ہندی نغمے حجازی لے میں گاتے رہے اس طرح اصل سے اپنا رشتہ قائم رکھ کر دوسروں کو بھی اس بات کا درس دیتے رہے۔ ع

وابستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ

یہ نظم مسدس کی حیثیت میں لکھی گئی۔ مثنوی یا ترکیب بند کے بعد علامہ کی نظمیں اسی ہئیت میں مبنی ہیں۔ نظم کے داخلی ربط و بست اور اس کی تشکیل میں علامہ نے بڑی صناعی سے کام لیا ہے۔ اس قسم کی نظمیں عام طور پر تکرار کا شکار ہو جاتی ہیں لیکن اقبال کا شمار اردو کے ان چند

گئے چنے شعرا میں ہوتا ہے۔ جنھوں نے نظم کے فن کو بڑے سلیقے سے برتا ہے۔ اس لئے شکوے میں تکرارِ خیال کی بجائے ارتقائے خیال واضح طور پر محسوس ہوتا ہے۔ صنائع بدائع کے استعمال سے نظم کی دلکشی بڑھی ہے۔ خوبصورت فارسی آمیز ترکیب سے نظم کے حسن میں اضافہ ہوا ہے۔

علامہ کی طبیعت کو غزل کے ساتھ ایک خاص مناسبت تھی۔ ان کی نظموں میں بھی تغزل کے اعلیٰ نمونے مل جاتے ہیں۔ یہ بند ملاحظہ فرمائیں اس کے اشعار نظم کی بجائے غزل کے شعروں میں کھڑے ہیں ؎

تیری محفل بھی گئی چاہنے والے بھی گئے
شب کی آہیں بھی گئیں صبح کے نالے بھی گئے

دل تجھے دے بھی گئے اپنا صلہ لے بھی گئے
آکے بیٹھے بھی نہ تھے اور نکالے بھی گئے

آئے عشاق گئے وعدۂ فردا لے کر
اب انھیں ڈھونڈھ چراغِ رخِ زیبا لے کر

توحید پر عمل کے نتیجے میں مسلم معاشرہ مساوات کی کیسی سچی تصویر پیش کرتا تھا۔

آگیا عین لڑائی میں اگر وقتِ نماز
قبلہ رو ہو کے زمیں بوس ہوئی قوم حجاز

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تیری سرکار میں پہونچے تو سبھی ایک ہوئے

ماضی کے ان کارناموں کے بعد علامہ مسلمانوں کی موجودہ زبوں حالی کی طرف آتے ہیں اور شکوے کی ابتداء ہوتی ہے اور اس کی لے بتدریج تیز سے تیز تر ہوتی چلی جاتی ہے گلہ مندی کا آغاز کچھ اس طرح سے ہوتا ہے ؎

پھر بھی ہم سے یہ گلہ ہے کہ وفادار نہیں
ہم وفادار نہیں تو بھی تو دلدار نہیں

اور نقطۂ عروج یہ ہے :—

کبھی ہم سے کبھی غیروں سے شناسائی ہے
بات کہنے کی نہیں تو بھی تو ہرجائی ہے

اس کے بعد شکوے کا زور آہستہ آہستہ ٹوٹتا نظر آتا ہے۔ شاعر کے لہجے میں نرمی پیدا ہوتی چلی جاتی ہے۔ اور یہ نرمی نظم کے آخری حصے تک پہونچتے پہونچتے دعا میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اور علامہ اقبال فرماتے ہیں ؎

مشکلیں امتِ مرحوم کی آساں کر دے
مورِ بے پایہ کو ہمدوش سلیماں کر دے
جنسِ نایابِ محبت کو پھر ارزاں کر دے
ہند کے دیر نشینوں کو مسلماں کر دے
جوئے خوں مے چکد از حسرتِ دیرینۂ ما
مے تپد نالہ بہ نشتر کدہ سینۂ ما

والدہ مرحومہ کی یاد میں

"تاریخ کے اوراق میں جہاں کہیں کوئی ایسی شخصیت چمکتی نظر آئی ہے جس نے کسی نہ کسی طرح اپنے فکر و عمل سے انسان پر زندگی کی مشکلیں آسان کی ہیں، اقبال نے اس کے آگے سر عقیدت سے جھکایا ہے، لیکن بعض موقعے ایسے بھی آئے ہیں جہاں اقبال کی اس عقیدت نے محبت کا رنگ اختیار کیا ہے اور دیکھنے اور سننے والوں کو یادوں کے پیمانے میں سرشکِ غم کی سرخی چھلکتی دکھائی دی ہے۔ یہ سرخی پڑھنے والوں کو قدم قدم پر اس مرثیے میں نظر آتی ہے جو اقبال نے والدہ مرحومہ کی یاد میں لکھا ہے۔"

اقبال کا دل محبت اور عقیدت کا سرچشمہ اور سوز و دردمندی کی دولت خداداد کا خزینہ ہے۔ اس دل میں انسانی محبت کے شعلے اٹھتے اور ہر دردمند دل کو اپنے سوز سے گرماتے ہیں، کبھی حیات کا راز سربستہ آشکار کرکے اور کبھی خودی کے سرنہاں کی عقدہ کشائی کرکے۔ اسی لئے تاریخ کے اوراق میں جہاں کہیں کوئی ایسی شخصیت چمکتی نظر آتی ہے جس نے کسی نہ کسی طرح اپنے فکر و عمل سے انسان پر زندگی کی مشکلیں آسان کی ہیں اقبال نے اس کے آگے

سرِ عقیدت جھکایا ہے۔ عقیدت کے انداز اور اس کے کیف و کم میں البتہ فرق رہا ہے۔ اقبال کے ذہن نے اور اس سے بھی زیادہ ان کے دل نے ہر جگہ اظہارِ عقیدت میں مدارج قائم کئے ہیں اور ان کا عکس پڑھنے والے کو آسانی سے اقبال کے شعروں میں مل جاتا ہے۔

بانگ درا کی کئی نظمیں عقیدت کے اس احساس اور جذبے کی مظہر ہیں۔ ان نظموں میں اقبال نے آرنلڈ، سرسید، غالب اور داغ جیسی شخصیتوں کی تربتوں پر عقیدت کے پھول چڑھائے ہیں لیکن بعض موقعے ایسے بھی آتے ہیں جہاں اقبال کی اس عقیدت نے محبت کا رنگ اختیار کیا ہے اور دیکھنے اور سننے والوں کو یادوں کے پیمانے میں سرشکِ غم کی سرخی چھلکتی دکھائی دی ہے۔ تلاش کرنے سے اکا دکا شعر شاید ایسے مل جائیں جن میں اس سرخی کی ایک ہلکی سی تحریر عکس فگن ہے:

آرزو کو خون رُلواتی ہے بیدادِ اجل — مارتا ہے تیر تاریکی میں صیادِ اجل
کشتۂ عزلت ہوں، آبادی میں گھبراتا ہوں میں — شہر سے سودا کی شدت میں نکل جاتا ہوں میں
یادِ ایامِ سلف سے دل کو تڑپاتا ہوں میں — بھر لسکیں تیری جانب دوڑتا آتا ہوں میں

لیکن سرخی کی اس ہلکی سی تحریر میں غم کی وہ شدت نہیں جو رگوں میں دوڑتے پھرتے لہو کو آنسو بنا کر آنکھ سے ٹپکا دے۔ یہ سرخی پڑھنے والے کو قدم قدم پر اس مرثیے میں ملتی ہے جو اقبال نے والدہ مرحومہ کی یاد میں لکھا ہے۔

"والدہ مرحومہ کی یاد میں" اردو میں اقبال کی شاید واحد نظم ہے جس میں وہ پڑھنے والے کو فکر اور جذبہ دونوں کے دام میں اسیر نظر آتے ہیں۔ مفکر، مصلح اور پیغامبر اقبال کو اپنی زندگی کے اس دور میں جب فکری تذبذب کے مرحلوں سے گذر کر وہ ایک ایسی منزل پر پہنچ چکے ہیں جہاں ان کے ہاتھوں میں انسان کے لئے عمل، یقین اور امید کا ایک تابندہ

مشغل موجود ہے۔ ایک ایسی سخت جذباتی چوٹ کا مقابلہ کرنا پڑا ہے کہ وہ مفکرانہ انداز اختیار کرنے کی کوشش کے باوجود جذبات کے گداز سے مغلوب معلوم ہوتے ہیں۔ اقبال جن کا نصب العین ذہن کو فکر اور عمل کی دعوت دینے کے سوا اور کچھ نہیں اب دل کی چوٹ کھا کر ایسی باتیں کہتے ہیں جن سے دلوں پر چوٹ لگتی ہے، دلوں میں گداز پیدا ہوتا ہے اور غم کے نشتر سے بھرے ہوئے زخم پھر رسنے لگتے ہیں۔ بالآخر آنکھیں دل کے داغ کا آئینہ بن جاتی ہیں اور انسان کے لئے غم کی کسک زندگی کی سب سے عزیز چیز بن جاتی ہے۔

غم کی یہی کسک اور جذبے کا یہی گداز ہے جس نے اقبال سے نظم کا آغاز اس چھوٹے سے بند سے کرایا ہے:

ذرہ ذرہ دہر کا زندانیٔ تقدیر ہے — پردۂ مجبوری و بے چارگی تدبیر ہے
آسماں مجبور ہے شمس و قمر مجبور ہیں — انجم سیماب پا رفتار پر مجبور ہیں
ہے شکست انجام غنچے کا سبو گلزار میں — سبزہ و گل بھی ہیں مجبورِ نمو گلزار میں

اقبال جن کے نظامِ فکر میں صرف "جمادات و نباتات تقدیر کے پابند" ہیں درد کی کسک سے مجبور ہو کر دہر کے ہر ذرے کو زندانیٔ تقدیر اور تدبیر کو مجبوری و بے چارگی کا پردہ کہہ رہے ہیں اور اپنی بات میں زور اور تاثیر پیدا کرنے کے لئے اپنی بات کو یوں زور دے کر دہرا رہے ہیں۔

آسماں مجبور ہے شمس و قمر مجبور ہیں — انجم سیماب پا رفتار پر مجبور ہیں
سبزہ و گل بھی ہیں مجبورِ نمو گلزار میں

جبر و قدر کے معاملے میں صوفیوں کے مسلک مجبوری پر لعن طعن کرنے والا اقبال جب جبر کی ہم نوائی میں یہ شدت اختیار کرے تو اس سے سوائے اس کے اور کوئی نتیجہ نہیں نکلتا کہ دل کی چوٹ نے ابھر کر فکر کی دنیا کو اس طرح اپنا اسیر بنا لیا ہے کہ اختیار کا پیامی مجبوری کا پیام

اونچا کر کے اسے دنیا میں عام کرنا چاہتا ہے۔

ایک عزیز اور بے حد عزیز جنس کو کھو دینے کے بعد ایک ایسے شخص کے دل پر کیا گذرتی ہے جو زندگی کے ہر سلسلے کو یہاں تک کہ موت اور زیست کو بھی جذبے کی دنیا سے نکال کر جہان فکر میں داخل کر لیتا ہے۔ اس کی ترجمانی اقبال کی اس دردانگیز نظم سے ہوتی ہے۔ ماں جیسی جان سے پیاری شئے کے چھن جانے کے بعد وہ فکر کی ساری آہنی زنجیریں توڑ پھوڑ کر جذبے کی طلائی زنجیریں پہن لیتا ہے اور جو فکر نے اسے اب تک بتایا اور سکھایا ہے اس سے بغاوت کر کے وہ کہتا ہے، جو جذبہ اس سے کہلوا تا ہے۔ لیکن جذبہ کتنا ہی شدید کیوں نہ ہو مستقل اور دائمی نہیں ہوتا۔ ثبات اور استحکام کی کمی ہی جذبے کا سب سے بڑا حسن ہے۔ اسی لئے جذبے کی شدت کو آہستہ آہستہ پیچھے ہٹا کر فکر پھر اپنی کھوئی ہوئی جگہ حاصل کر لیتی ہے لیکن جذبہ ایکا ایکی پھر اُبھرتا ہے اور شکست و ریخت کے سارے اسلحوں سے کام لے کر فکر پر غالب آجاتا ہے۔ ذہن کی دنیا پہ پھر دل کی دنیا کا راج ہو جاتا ہے۔

یہی کیفیت اقبال کی اس نظم میں ہے، فکر اور جذبے کے درمیان ذہن اور دل کے مکینوں کے درمیان لڑائی جاری رہتی ہے اور ایک اندرونی کش مکش کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ شاعر جو مفکر ہونے کا دعویٰ کر کے بھی حقیقت میں دل کی دنیا کا ترجمان ہے جب اس کشمکش کے لئے وسیلہ تلاش کرتا ہے تو اسے حسنِ ترتیب اور حسنِ بیان کا وہ لطیف جمیل پیکر ملتا ہے جو اس نظم کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے۔

پہلے بند میں زندگی اور مجبوری کو مترادف قرار دے کر دوسرے بند میں شاعر اس مجبوری کے ان نتائج کی طرف اشارہ کرتا ہے جو حیاتِ انسانی کو بے لطف و بے کیف حوادث کا مجموعہ بنا دیتے ہیں۔ غم کی شدت اور مجبوری کے احساس سے اشکوں کی روانی بند ہو جاتی ہے اور

زندگی میں کوئی لذت باقی نہیں رہتی۔ اس بند کی منطق شاعر کے حکیمانہ مزاج کی پیداکی ہوئی ہے لیکن منطق بہت دور تک نہیں جاتی کہ جذبۂ غم اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو جاتا ہے اور اپنی برتری جتا کر ساری منطق کا شیرازہ اس طرح بکھیر دیتا ہے۔

میرے لب پر قصۂ نیرنگیٔ دوراں نہیں　　دل مرا حیراں نہیں، خنداں نہیں، گریاں نہیں
پر تری تصویر قاصد گریۂ پیہم کی ہے　　آہ! یہ تردید میری حکمتِ محکم کی ہے

حکمت نے بڑی بے بسی سے جذبے کی عظمت کے آگے سپر ڈال دی ہے اور جذبے کے دیئے ہوئے الفاظ فضا میں گونج رہے ہیں، رقص کر رہے ہیں اور اپنی فتح کا اعلان کر رہے ہیں۔

دل مرا حیراں نہیں، خنداں نہیں، گریاں نہیں

قافیوں کی یہ تکرار اور اس تکرار کی پیدا کی ہوئی نغمگی جذبے کے خلوص اور شدت کی مرہونِ منت ہے، جو اپنے اظہار کے لئے الفاظ بھی خود تلاش کرتا ہے اور انھیں مرتب بھی اس طرح کرتا ہے کہ ذہنی کاوش اور ارادے کے قبضۂ قدرت سے باہر ہے۔ آمد اور آورد میں یہی فرق ہے۔ ایسے موقعوں پر ایک بات البتہ نمایاں ہوتی ہے کہ جہاں کہیں فکر نے جذبے پر سبقت لے جانے کی کوشش کی ہے وہاں صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ اس تصادم میں اسے کیسے کیسے جوکھم اٹھانے پڑے ہیں۔ اس فضا میں ہر طرف کاوش اور کشاکش کے آثار نمایاں ہوتے ہیں۔ دقیق الفاظ، پرشکوہ ترکیبیں اور دور از کار تشبیہیں اور استعارے، یہ اس کا سرمایہ ہیں۔

اس کے مقابلے میں فکر پر جذبے کی فتح ہمیشہ ہلکے پھلکے تبسم کے روپ میں ظاہر ہوتی ہے۔ سیدھے سادے روزمرہ کے الفاظ، سبک اور آسان ترکیبیں اور مانوس تشبیہیں فتح و ظفر کی اس مہم میں اس کے ہم رکاب ہیں۔

"والدہ مرحومہ کی یاد میں" میں فکر اور جذبے کی جو کشاکش یکے بعد دیگرے مختلف

بندوں میں ظاہر ہوتی رہی ہے اس میں بڑے مزے کی بات یہ ہے کہ جہاں کہیں فکر کا غلبہ ہے شاعر کے بیان میں تکلف، تصنع اور اس لئے بوجھل پن ہے اور اس کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہے کہ یہ بند ذہن کے لئے تو تسکین کا تھوڑا بہت سامان مہیا کر دیتے ہیں لیکن دل کی بارگاہ میں ان کا گذار نہیں ہوتا۔ دل کی گہرائیوں میں وہی بات اترتی ہے جو جذبے سے مغلوب اور متاثر ہو کر کہی گئی ہے یا جہاں فکر اور جذبہ ایک دوسرے کے ہم عناں و ہم نوا ہیں

آہ یہ دنیا، یہ ماتم خانۂ برنا و پیر
آدمی ہے کس طلسمِ دوش و فردا میں اسیر

کتنی مشکل زندگی ہے کس قدر آساں ہے موت
گلشنِ ہستی میں مانندِ نسیم ارزاں ہے موت

زلزلے ہیں، بجلیاں ہیں، قحط ہیں، آلام ہیں
کیسی کیسی دخترانِ مادرِ ایام ہیں

کلبۂ افلاس میں، دولت کے کاشانے میں موت
دشت و در میں، شہر میں، گلشن میں، ویرانے میں موت

یہ متاعِ دیدۂ تر پوری طرح صرف ہو جائے تو دل کو تسکین مل جاتی ہے اور انسان مستقبل کے سہانے خواب دیکھ کر مسرور و شادماں ہوتا ہے۔

ختم ہو جائے گا لیکن امتحاں کا دور بھی
ہیں پسِ نہ پردۂ گردوں ابھی دور اور بھی

نظم کی اس منزل تک پہونچتے پہونچتے اور فکر اور جذبے میں اتنی مکمل ہم آہنگی پیدا ہو گئی ہے کہ دونوں پوری طرح ایک دوسرے کی ہم نوائی کرتے ہیں۔ حکمت کی بات کو جذبے کی زبان مل جاتی ہے اور جذبے کا اظہار حکیمانہ انداز میں ہونے لگتا ہے اور موت ایک نئے روپ میں ہمارے سامنے آتی ہے، ایسا روپ جس میں فکر کی عظمت و وقار بھی ہے اور جذبے کا گداز اور نزاکت بھی:

آہ! اے غافل موت کا راز نہاں کچھ اور ہے
نقش کی ناپائیداری سے عیاں کچھ اور ہے

جنت نظارہ ہے نقش ہوا بالائے آب
موجِ مضطر توڑ کر تعمیر کرتی ہے حباب
موج کے دامن میں پھر اس کو چھپا دیتی ہے یہ
کتنی بے دردی سے نقش اپنا مٹا دیتی ہے یہ

اور پھر ایکا ایکی جذبہ فکر کی بندشوں سے آزاد ہو کر دل کی بات یوں کہہ اُٹھتا ہے :

کہتے ہیں اہلِ جہاں دردِ اجل ہے لادوا
زخم فرقت وقت کے مرہم سے پاتا ہے شفا
دل، مگر غم مرنے والوں کا جہاں آباد ہے
حلقۂ زنجیر صبح و شام سے آزاد ہے
وقت کے افسوں سے تھمتا نالۂ ماتم نہیں
وقت زخمِ تیغِ فرقت کا کوئی مرہم نہیں

مسعود حسین خاں

خضرِ راہ

اقبال نے اپنی طویل نظم خضرِ راہ کے بارے میں بدقسمتی سے کوئی شہادت نہیں چھوڑی ہے۔ اس لئے اس کے ماحول، اس کی فضا اور اس کی تخلیقی بازآفرینی کی تمام تر ذمہ داری اقبال کے نقاد پر آتی ہے۔

۱۹۱۸ء میں جنگِ عظیم اول کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ دنیا نے اس سے زیر دست تباہی کا منظر اس سے قبل کبھی نہیں دیکھا تھا ــــ انسانوں کی لاشیں، دست و پا بریدہ لاشیں لاکھوں بچے یتیم، ہزاروں عورتیں بیوہ، شہر برباد و ویران، یورپ سرنگوں، ایشیا شرمسار، فاتح مفتوح سے زیادہ شکستہ تر، کارخانے بند، کھیتیاں جھلسی ہوئی، خورد و کلاں برائے زیستن لیکن زیستن برائے چہ؟ یہ بڑا سوالیہ نشان ہر حساس ذہن پر قائم، زندگی بے اعتبار، حکومتیں بے اقتدار، ہندوستان بیدار، دنیائے اسلام تباہ و برباد، روس ایک نئے انقلاب سے دوچار، ایک لمحے کے لئے اس ہجوم نا امیدی و بربادی کا تصور کیجئے جو ۱۹۱۹ء کے اوائل میں اتحادیوں کی فتح یابی کے باوجود عالم پر طاری تھا۔ جنگ تا امن ایک خونی لکیر تھی۔ ہر متجسس ذہن متفکر تھا۔ زندگی کی بے اعتباری پر، قومی بربادی پر، انسان کی لاچاری پر۔

اقبال بھی جو ۱۹۱۹ء تک اپنا فلسفہ حیات مرتب کر چکے تھے، مردہ قوم کو اثبات حیات اور خودی کا درس دے چکے تھے۔ خاک وطن کے ہر ذرہ کو دیوتا تسلیم کر چکے تھے، بربادی کے اس منظر کی تاب نہ لا سکے۔ وطن میں رولٹ بل، جنرل ڈائر کا مارشل لاء اور قتل عام، گاندھی جی اور علی برادران کی قیادت میں عدم تعاون اور ترک موالات کی تحریک۔

دنیائے اسلام میں معاہدۂ سیورے (SEVERE) خلافت عثمانیہ کی بربادی اور شریف مکہ کی دغابازی کا رنج و غم تھا۔ اسی ذہنی کشاکش میں شاعر سکون کی تلاش میں ساحل دریا کی جانب رخ کرتا ہے، اسے ایک نئی صبح کی تلاش ہے، جہاں زندگی بامعنی ہو، جہاں اس کا وطن عزیز غلامی کے جال سے نکل کر آزاد فضا میں سانس لے سکے، جہاں دنیائے اسلام یورپی رخنہ گردن کے فتنہ و فساد سے محفوظ رہ سکے۔ اس عالم میں پہونچ کر شاعر کا ذہن خود کو دو حصوں میں منقسم کر لیتا ہے۔ شاعر اقبال اور مفکر اقبال۔ شاعر اقبال مضطرب ہے، اس کے دل میں ایک ہنگامہ محشر بپا ہے، وہ بربادی عالم پر سوالات قائم کرتا ہے۔ مفکر اقبال بصورت خضر راہ جواب دیتا ہے اقبال نے یہاں ایک قدیم اسلامی روایت کی اشارت نگاری سے فائدہ اٹھایا ہے اور "پیک جہاں پیما" خضر کو ایک ڈرامائی کردار کی شکل میں پیش کیا ہے۔ شاعر اور خضر کے درمیان جو مکالمہ ہونے والا ہے۔ اس کے لئے ایک پرسکون پس منظر کی ضرورت تھی، اقبال، جو "بانگ درا" کی منظر نگاری کے کامیاب شاعر بن چکے تھے، ہلکے اشاروں اور بستہ اسلوب میں سکون و سکوت کا منظر ان الفاظ میں کھینچتے ہیں:

ساحل دریا پہ میں اک رات تھا محو نظر — گوشۂ دل میں چھپائے اک جہان اضطراب
شب سکوت افزا، ہوا آسودہ، دریا نرم سیر — تھی نظر حیراں کہ یہ دریا ہے یا تصویر آب
جیسے گہوارے میں سو جاتا ہے طفل شیر خوار — موج مضطر تھی کہیں گہرائیوں میں مست خواب

رات کے انسوں سے طائر آشیانوں میں اسیر انجم کم ضو گرفتار طلسم ماہتاب

ان اشعار میں (س) اور (ش) کی تکرار، رمل کی چال، طویل مصوتوں، اور غنہ کی گونج وادیاں منظر کی خاموشی، سکون اور سکوت کی عکاسی کے ساتھ ہم آہنگ ہیں۔

ایسے میں حضرت خضر نمودار ہوتے ہیں جو بھولے بھٹکوں کی رہنمائی کرتے ہیں مضطرب اور شاعر اقبال، مفکر اقبال یعنی علامتی پیکر، خضر سے پانچ سوال کرتا ہے، سوال کرنے سے قبل خراجِ تحسین کے طور پر چند کلمات 'کشتی مسکین' 'جانِ پاک' اور 'دیوارِ یتیم' کی تلمیحات کے حوالے سے ان کی شان میں کہتا ہے ؎

اے تری چشمِ جہاں بیں پر وہ طوفاں آشکار جن کے ہنگامے ابھی دریا میں سوتے ہیں خموش

اقبال کا خضر سے پہلا سوال ع چھوڑ کر آبادیاں رہتا ہے تو صحرا نورد؟

" " دوسرا سوال ع زندگی کا راز کیا ہے؟

" " تیسرا سوال ع سلطنت کیا چیز ہے؟

" " چوتھا سوال ع اور یہ سرمایہ و محنت میں ہے کیسا خروش؟

" " پانچواں سوال جو اقبال کے دل کے زیادہ قریب تھا، یہ ہے۔

بیچتا ہے ہاشمی ناموسِ دینِ مصطفیٰ خاک و خوں میں مل رہا ہے ترکمانِ سخت کوش

چنانچہ انھیں پانچ سوالوں کے جوابات کے طور پر اس نظم کے پانچ بندوں کے ذیلی عنوانات قائم کیے گئے ہیں جو حسب ذیل ہیں۔

۱۔ صحرا نوردی، ۲۔ زندگی، ۳۔ سلطنت، ۴۔ سرمایہ و محنت، اور ۵۔ دنیائے اسلام۔

خضر سے اقبال کا پہلا سوال اس کی صحرا نوردی سے متعلق ہے، بظاہر یہ سوال غیر متعلق اور ذاتی نوعیت کا ہے اس لئے کہ خضر کی صحرا نوردی اور روپوشی روایتاً مسلم ہے جس کا اثر

غالب کے ذہن میں بالکل مختلف انداز کا تھا ؎

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناس خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لئے

لیکن اقبال نے خضر کی صحرا نوردی کو اپنے نقطۂ نظر سے زیادہ بامعنی پایا۔ اس لئے کہ یہ استعارہ ہے مسلسل عمل اور تگ و دو کا اور اس لحاظ سے اس کا اقبال کے فلسفۂ زندگی سے گہرا رشتہ ہے جو اقبال کے مطابق "جاوداں پیہم دواں ہر دم جواں" ہے۔ صحرا نوردی اور زندگی دونوں میں ان کے نزدیک ایک ربط معنوی ہے "زندگی کے موضوع کی جانب گریز کرنے کے لئے ہی وہ صحرا نوردی والے بند کا اختتام اس شعر پر کرتے ہیں ؎

پختہ تر ہے گردشِ پیہم سے جام زندگی
ہے یہی اے بے خبر رازِ دوامِ زندگی

خضر راہ ہیئت کے اعتبار سے ایک ترکیب بند ہے۔ ترکیب بند کے آخر شعر میں قافیہ بدل کر شاعر نئے بند کا آغاز کرتا ہے۔ چنانچہ صحرا نوردی کا بند لفظ "زندگی" پر ختم ہوتا ہے اور اگلا بند "زندگی" کے عنوان سے شروع ہوتا ہے جو جواب ہے سوال نمبر ۲ "زندگی کیا ہے؟ کا! اس بند کے ابتدائی اشعار اس بانگ یقین کے ساتھ شروع ہوتے ہیں ؏

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی
تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ جاوداں پیہم دواں ہر دم جواں ہے زندگی

اردو شاعری میں یہ ایک حیات آفریں اور منفرد آواز تھی۔ جس معاشرہ کی آواز یہ ہو کہ ؏ زندگی نام ہے مر مر کے جئے جانے کا، وہاں یہ غلغلہ اٹھے ؏

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے سرّ آدم ہے ضمیر کن فکاں ہے زندگی

دیکھئے کس مابعد الطبیعاتی سطح سے اقبال زندگی کی نئی تعریف کر رہے ہیں یہ نہ صرف جنگ کی تباہ کاری کے علی الرغم ہے بلکہ اقبال کے فلسفہ اثباتِ حیات کے عین مطابق بھی۔ "سود و زیاں" سے برتر کہہ کر وہ حیاتِ انسانی کو نیا اعتبار دے رہے ہیں۔ اس کو "ضمیرِ کن فکاں" کہنے کے بعد ہی وہ اس کی "قوتِ تسخیر" اور "قوتِ پنہاں" کو آشکار کر سکتے ہیں۔ وہ اس کے عمل کی عظمتوں کا اس طرح نقشہ کھینچتے ہیں ؎

پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار
اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے

اس زندگی کے لئے آزادی شرط ہے۔ مسلسل عمل اسے خام سے پختہ کرتا ہے اور مٹی کے انبار کو 'شمشیر بے زنہار' میں تبدیل کر دیتا ہے۔

مابعد الطبیعاتی سطح پر زندگی کو نئی تعریف سے آشنا کرنے کے بعد شاعر درجہ بدرجہ اس کے ملّی و قومی ظہور کا ذکر کرتا ہے ؎

خاک مشرق پر چمک جائے مثالِ آفتاب
تا بدخشاں پھر وہی لعلِ گراں پیدا کرے

زندگی کا اجتماعی شعور شاعر کو 'سلطنت' کے راز فاش کرنے کی جانب مائل کرتا ہے' اس بند میں وہ یورپی اقوام کے سامراجی نظام کا پول 'قرآن کریم' کی آیت 'اِنَّ الْمُلُوْکَ' سے (بیشک جب بادشاہ کسی قریہ میں داخل ہوتے ہیں تو فساد ڈال دیتے ہیں) اور بتاتا ہے کہ ملوکیت بھی ایک قسم کی جادوگری ہے' جو مغلوب اقوام سے ان کا احساس آزادی و خودی تک چھین لیتی ہے۔ اس نکتے کی وضاحت کے لئے اس کا تخلیقی ذہن اب 'محمود و ایاز' اور 'موسیٰ و طلسم سامری' کی تلمیحات کا سہارا لیتا ہے ؎

جادۂ محمود کی تاثیر سے چشمِ ایاز — دیکھتی ہے حلقۂ گردن میں سازِ دلبری
خونِ اسرائیل آجاتا ہے آخر جوش میں — توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰ طلسمِ سامری

اس عمومی تاثر کے بعد شاعر کا ذہن ہندوستان کی جانب منتقل ہوتا ہے جہاں ۱۹۱۹ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے نفاذ کی تیاریاں ہو رہی ہیں اور ڈیوک آف کنیاٹ ۹ فروری ۱۹۲۱ء کو بہ نفس نفیس تشریف لاکر حضور ملک معظم کی جانب سے یہ اعلان فرما رہے ہیں۔

"سالہا سال سے بلکہ چند نسلوں سے ہمدردانِ ملک اور وفادار ہندوستانی اپنی بھارت ماتا کے لئے سوراج کا خواب دیکھ رہے تھے۔ آج میری سلطنت میں آپ کے لئے سوراج کی ابتدا ہو رہی ہے اور آپ کی ترقی کے وسیع ترین اور اعلیٰ درجہ کے مواقع مل رہے ہیں جن سے میری نوآبادیات کی مانند آزادی حاصل ہو۔"

اس اعلان سے لبرل جماعت کے خوش عقیدہ حضرات کی خوشی کی کوئی انتہا نہیں رہی اور انھوں نے جدید کونسلوں میں داخل ہو کر وزارتوں کی کرسیاں سنبھال لیں لیکن جن کے پیشِ نظر سوراج تھا وہ انگریزوں کی ابلیسانہ سیاست اور دیو استبداد کی جمہوری قبا میں پائے کوبی کو اچھی طرح بھانپ گئے۔ اقبال نے اسی نقطۂ نظر سے ۱۹۱۹ء کے ایکٹ پر کڑی تنقید کی ہے۔

ہے وہی ساز کہن مغرب کا جمہوری نظام — جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب — تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلسِ آئین و اصلاح و رعایات و حقوق — طب مغرب میں مزے میٹھے، اثر خواب آوری
گرمیٔ گفتارِ اعضائے مجالس، الاماں! — یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگِ زرگری
اس سرابِ رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو — آہ! اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

ان اشعار میں اقبال کی اس عہد کی وطنی اور سیاسی فکر کی نشاندہی کی جا سکتی ہے۔ یہ فکر وہی ہے جس نے اس زمانے میں علی برادران اور گاندھی جی کو کچھ عرصے کے لئے یکجا اور مسلم لیگ اور کانگریس کے لئے ایک متحدہ قومی پلیٹ فارم فراہم کر دیا تھا۔ دراصل ۱۹۲۱ء کا سال ہماری قومی تحریک کی سب سے اونچی لہر تھا۔ دسمبر ۱۹۲۱ء میں مسلم لیگ اور کانگریس کے اجلاس ایک ساتھ احمد آباد میں ہوئے۔ کانگریس کے اجلاس کی صدارت حکیم اجمل خاں نے کی اور مسلم لیگ کے اجلاس کی صدارت مولانا حسرت موہانی نے۔ ہر طرف ترکِ موالات اور سوراج کا نعرہ بلند ہو رہا تھا۔ اقبال نے قومی تحریک کے اس منتہا کو بھرپور انداز میں اِن اشعار میں پیش کیا ہے جو ابھی سُنا چکا ہوں۔

اقبال کا خضر سے تیسرا سوال سرمایہ و محنت کی کشمکش کے بارے میں تھا۔ ۱۹۱۷ء میں لینن کی قیادت میں روس کا سرخ انقلاب ہو چکا ہے مغربی جمہوریتیں اس انقلاب کی کامیابی کو مشتبہ نظروں سے دیکھ رہی تھیں لیکن جب اس نے نہ صرف جنگِ عظیم کے تھپیڑوں کو انگیز کر لیا بلکہ جنگ کے بعد تیزی کے ساتھ ملک کی تعمیرِ نو بھی شروع کر دی تو مفکرینِ مغرب کو اپنی رائے تبدیل کرنا پڑی۔ ایشیا کی غلام اقوام کے لئے یہ انقلاب 'بطنِ گیتی' سے 'آفتابِ تازہ' کا ظہور تھا۔ مغربی جمہوریتوں کی سامراجیت کے خلاف جذبہ نفرت پہلے سے موجود تھا۔ اقبال اسے 'نوائے قیصری' سے تعبیر کر چکے تھے۔ لہٰذا امید کی تمام نگاہیں اس انقلاب پر مرکوز ہو گئیں جو 'بندۂ مزدور' کی حیاتِ نو سے عبارت تھا۔ اقبال نے 'بندۂ مزدور' کو اس وقت پیغام دیا ہے جب ہندوستانی مزدور تحریک سے آشنا بھی نہیں ہوا تھا۔ اور اُردو ادب کی تاریخ میں ترقی پسندی کی روایت قائم ہونے میں ابھی کم از کم چودہ سال کی مدت باقی تھی۔ یہ پیغام اس قدر پُرجوش الفاظ اور اس قدر بصیرت افروز علائم میں دیا گیا ہے کہ میرا خیال ہے کہ ترقی پسند ادب کا یہی صحیح معنوں میں منشور ہے۔

پیغام دو بندوں پر مشتمل ہے، پہلے بند میں سرمایہ دار کی حیلہ گری اور مکر کی چالوں کا ذکر کیا ہے ؏

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے | خضر کا پیغام کیا، ہے یہ پیام کائنات
اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دارِ حیلہ گر | شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات
دستِ دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی | اہلِ ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات

اقبال کا خلاق ذہن کا یہ کمال ہے (اور اس میں اقبال بے مثال ہے) کہ اردو شاعری کے قدیم علائم کو معنی کے نئے سیاق و سباق عطا کر دیتا ہے۔ "ساحرالموت" "اور برگِ حشیش" کو وہ سرمایہ دار و مزدور کے باہمی رشتے کے لئے نہایت خوبی کے ساتھ استعمال کرتا ہے اور پھر یوں انداز میں سیاسی تجزیہ ان الفاظ میں کرتا ہے ؎

نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ | "خواجگی" نے خوب چن چن کر بنائے مسکرات

مارکسی فلسفے کی اس سے بہتر شاعرانہ تعبیر اور کیا ہو سکتی ہے، لیکن مزدور کے مات کھانے کا دور ختم ہو چکا ہے اس لئے شاعر اس امید افزا پیغام کے ساتھ گریز کرتا ہے ؏

اٹھ کہ اک بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے | مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

دوسرے بند میں جس میں "کب تلک" کی متروک ردیف استعمال کی گئی ہے اقبال روسی انقلاب کو "آفتابِ تازہ" کہہ کر خوش آمدید کہتا ہے۔ جب کوئی نیا نظامِ حیات طلوع ہوتا ہے تو زندگی کے پرانے ڈھانچوں کا ٹوٹنا لازمی امر ہے۔ اس کا افسوس نہیں کرنا چاہئیے، اقبال اس نئے انقلاب کو پھر مابعد الطبیعاتی سطح پر لے جا کر عروجِ آدم کا قصہ بنا دیتا ہے ؏

توڑ ڈالیں فطرتِ انساں نے زنجیریں تمام | دوریٔ جنت سے روتی چشمِ آدم کب تلک

اقبال نے اس بند میں اشتراکی انقلاب کے ایجابی پہلو کو سراہا ہے، وہ مغربی جمہوریت اور مساوات کے مدعیوں کو چیلنج کرتے ہیں :

تدبّر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے

لیکن سرمایہ داری پر اس کڑی تنقید کے باوجود اور اشتراکیت اور اسلام کی مماثلت کا عرفان رکھنے کے باوجود (''میں اسلام کو ایک قسم کی اشتراکیت ہی سمجھتا ہوں''۔ مکتوب) اقبال مارکسی فلسفے کی لادینی سے غیر مطمئن رہے۔ اور اپنے مخصوص انداز میں اس فکر کے بارے میں کہا ہے کہ یہ 'لا' کے مقام سے اِلّا اللہ تک نہیں پہونچ سکی، لیکن فی الحال یہ بحث ہمارے موضوع سے خارج ہے۔

خضر سے اقبال کا آخری سوال دنیائے اسلام سے متعلق تھا۔ داستان ترک و عرب سے متعلق، خلافت عثمانیہ کی بربادی اور حکمت مغرب سے ملت کا پارہ پارہ ہو جانا۔ اتحادیوں کا قسطنطنیہ پر قبضہ اور ۱۹۱۹ء میں ان کے اشارے پر یونانی افواج کا سواحل سمرنا پر قدم رکھنا۔ اس وقت ایک آگ سی ہندوستان میں لگ گئی۔ مہاتما گاندھی نے ٹیگور کے علی الرغم تحریکِ خلافت کی تائید کی اور اس طرح تاریخ کا وہ بے مثال قومی اتحاد قائم ہوا جس کی نظیر آج تک نہیں ملتی۔ تحریک عدم تعاون ۱۹۲۱ء میں اپنے شباب پر پہونچ گئی تھی، جب خضرِ راہ اقبال کے ذہن میں جنم لے رہی تھی۔ اقبال ''خاک حجاز'' کو ''خشتِ بنیاد کلیسا'' بنا ہوا دیکھ رہے تھے۔ تمام عالم اسلام مغرب کے سامنے سرنگوں تھا۔ 'کلاہِ لالہ رنگ' مجبورِ نیاز تھی۔ ایران یورپ سے ایسی ''مے سرکش'' کا طلبگار تھا، جس کی حرارت سے اقبال کے خیال میں اس کی مینا چور چور ہو جائے گی بشریف مکہ (ہاشمی) نامور دینِ مصطفےٰ بیچ رہا تھا اور انگریزوں کے جال میں گرفتار تھا۔ غرضکہ ہر طرف مسلمان کے

خون کی ارزانی تھی۔ ایسے میں اقبال کا مفکر ذہن مرشد رومی کے حوالے سے عالم اسلام کو یہ پیغام دیتا ہے:

گفت رومی ہر بنائے کہنہ کآباداں کنند　　　می ندانی اول آں بنیاد را ویراں کنند

اقبال کی رجائی اور پیش نظری اس ویرانے کے آگے ایک گلستان دیکھتی ہے خودی کی اصطلاح استعمال کئے بغیر اس کا سبق دیتی ہیں۔

مومیائی کی گدائی سے تو بہتر ہے شکست　　　مور بے پر! حاجتے پیش سلیمانے مبر

وہ ملتِ بیضا کو ربط و ضبط کا سبق دیتے ہیں اور اسی میں ایشیا کی نجات سمجھتے ہیں سوئے حرم ناقہ کو تیز تر کرنے کی تلقین کرتے ہیں کہ اسلام میں سیاست اور دین علاحدہ حقیقتیں نہیں۔ اور یہ اسلامیت کا سیاسی سبق یوں پڑھاتے ہیں۔ ؏

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے　　　نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر

ہدایت کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے وہ امتیازِ نسل و نسب کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں اور بالآخر ایک ایسی خلافت کی بنا استوار کرنا چاہتے ہیں جو ملّت اسلامیہ کو سیاسی وحدت کے سررشتے میں لاسکے۔

اب ہم خضرِ راہ کے آخری بند تک پہونچ چکے ہیں۔ شاعر کا اضطراب سکون و قرار میں تبدیل ہو چکا ہے۔ اس کی چشمِ دل وا ہو چکی ہے۔ وہ اب دانائے راز بن چکا ہے اسی لئے اب قنوطیت کے پردے چاک ہونے لگے ہیں وہ تقدیرِ امت کو بے حجاب دیکھ رہا ہے۔ اسکی فریاد اب تاثیر میں بدل چکی ہے۔" ؏ رخ مغرب بیاں" میں اسے زوال کی سیاہ لکیریں نظر آنے لگی ہیں۔ اسلام کا عام حریّت کا خواب بہ شکل انقلاب روس اور تحریکِ آزادی ہند رنگ لا رہا ہے ؏

عشق کو فریاد لازم تھی سو وہ بھی ہو چکی
اب ذرا دل تھام کر فریاد کی تاثیر دیکھ

تو نے دیکھا سطوتِ رفتارِ دریا کا عروج
موج مضطر کس طرح بنتی ہے اب زنجیر دیکھ

عام حریّت کا دیکھا تھا جو خواب اسلام نے
اے مسلماں! آج تو اس خواب کی تعبیر دیکھ

کھول کر آنکھیں مرے آئینۂ گفتار میں
آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ

آزمودہ فتنہ ہے اک اور بھی گردوں کے پاس
سامنے تقدیر کے رسوائیٔ تدبیر دیکھ

مسلم استی سینہ از آرزو آباد دار
ہر زماں پیش نظر لا تخلف المیعاد دار

اِنّ اللہ لا یخلف المیعاد "بے شک اللہ وعدہ خلافی نہیں کرتا" اس پر اقبال کا پیغام امید ختم ہوتا ہے۔ یہ اثبات یقین کا یام عروج ہے یہ عقل کی منزل اور عشق کا حاصل ہے "دیکھ" کی ردیف اسے ایک قرآنی اسلوب عطا کرتی ہے۔ تاثیر، زنجیر، تعبیر اور تصویر کے قافیے اس میں حرکت کا احساس دلاتے ہیں۔ موضوع میں بشیری بھی ہے اور نذیری بھی، نذیری اقوامِ غالب اور سطوت دریا اور تدبیر تہذیب کے لئے، بشیری خواب اسلام، سینۂ پُرآرزو، اور ایمان محکم رکھنے والوں کے لئے۔ اقبال کا یہی اندازِ سخن ہے جس کے بارے میں سجاد انصاری نے لکھا تھا کہ "اگر قرآن اُردو میں نازل ہوتا تو اقبال کی نظم یا ابوالکلام کی نثر کا پیرایہ اختیار کرتا۔

حسن سجاد

طلوعِ اسلام

اقبال نے اپنی مشہور نظم طلوعِ اسلام ۱۹۲۳ء میں لکھی۔ یہ نظم اقبال کے اس دورِ شاعری سے تعلق رکھتی ہے۔ جب وہ پورے عالم اسلام کے اتحاد کا خواب دیکھ رہے تھے اور یہ چاہتے تھے کہ مسلمان من حیث القوم متحد ہو کر مغربی استعمار کے خلاف جدوجہد کے لئے اٹھ کھڑے ہوں۔ چنانچہ ترکی میں مصطفےٰ کمال کی شاندار فتح سے متاثر ہو کر انھوں نے اس نظم کی تخلیق کی۔ اس لئے کہ مصطفےٰ کمال کی فتح کی صورت میں انھیں مسلمانوں کے اتحاد کا خواب پورا ہوتا نظر آرہا تھا۔

مشہور انگریزی شاعر ٹینی سن نے ایک جگہ لکھا ہے کہ جس شاعری سے قوم کے افراد کا دل مضبوط ہوتا ہے اور اس کی ہمتیں بلند ہوتی ہوں۔ اس شاعری کو اعلیٰ درجے کی نیکیوں میں شمار کرنا چاہیئے۔

اقبال نے اپنی فکر اور شاعری سے جو کام لیا ہے اگر اس کو پیشِ نظر رکھا جائے تو بلاشبہ ان کی شاعری ٹینی سن کے اس قول پر پوری اترکے اعمالِ حسنہ کے دائرے میں داخل ہو جاتی ہے۔ اقبال کو جو زمانہ میسّر ہوا وہ ملک و قوم کی زندگی کے ہر شعبہ میں انتشار و پراگندگی کا زمانہ تھا۔ شعر و ادب میں بھی نئی قدروں، نئے خیالات و تصورات اور نئے آہنگ کی شدید ضرورت محسوس

کیجا رہی تھی۔ اُردو شاعری جس کی اصل کائنات غزل تھی۔ اپنے تمام امکانات کو بروئے کار لاکر بظاہر اپنے مقصد کی تکمیل کر چکی تھی اور اب اس میں کوئی جان باقی نہ رہی تھی۔ غزل گو شعراء بقول مولانا حالی کے اُگلے ہوئے نوالے چبا رہے تھے اور ان کی شاعری کا بیشتر حصہ یا تو حزن و یاس میں ڈوبا ہوا تھا یا سطحی لذت پرستی اور وقتی خوش باشی کی ترغیب دیتا تھا۔ شاعری کا زندگی اور اس کے مسائل سے براہ راست کوئی رابطہ نہ تھا اور ہمارے شاعروں میں اجتماعی حقیقتوں سے آنکھ ملانے کا حوصلہ باقی نہ رہا تھا۔ مولانا حالی نے مسدس لکھ کر قومی احساس کو بیدار کرنے کی سعی جمیل کی تھی اور قومی شاعری کا باب ضرور کھول دیا تھا۔ لیکن ہماری شاعری میں آفاقی اور اجتماعی زندگی کا شعور پیدا کر کے اس میں نئی وسعتیں اور نئے امکانات اقبال ہی نے پیدا کئے۔ مولانا حالی کی مسدس طائر زیر دام کے نالے کی مانند تھی اور اقبال کی شاعری بقول نیاز نالۂ طائر زیر دام کی حیثیت رکھتی ہے

اقبال نے روایتی اور رسمی مضامین کی تقلید سے بہت جلد اپنے آپ کو آزاد کر لیا تھا اور مروجہ مصنوعی اور تقلیدی شاعری کو چھوڑ کر اپنی شاعری کی لگام اپنی فطرت کے باطنی تقاضے کے ہاتھ میں دے دی تھی، ۱۹۰۵ء تک اقبال نے جو شاعری کی اسے انھوں نے اپنی شاعری کا دور اول قرار دیا تھا۔ ۱۹۰۵ء میں وہ عازم یورپ ہوئے اور قیام یورپ نے ان کی فکر پر بہت کچھ اثر ڈالا اور ان کی طبیعت کا رنگ بہت کچھ بدل دیا۔ یہی وہ زمانہ ہے جب ہندوستان کے پڑھے لکھے طبقے میں غلامی سے بیزاری اور آزادی کی طلب بڑی تیزی سے پیدا ہو رہی ہے جدید تعلیم نے افراد میں حب الوطنی کے جذبات کو بیدار کر دیا ہے اور اپنے آپ کو آزاد اور ترقی یافتہ اقوام کی صف میں دیکھنے کی خواہش زور پکڑتی جا رہی ہے۔ اسی زمانے میں اقبال یورپ میں تین سال قیام کے بعد واپس لوٹتے ہیں اور اپنے تجربات و مشاہدات کا نچوڑ اس

نظریئے میں پیش کرتے ہیں کہ ہندوستان کے مسائل کا حل مغربی انداز کی جمہوریت میں نہیں بلکہ ایک ایسے نظام سیاست میں ہے جس میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو اپنے اپنے عقائد کے مطابق زندگی بسر کرنے کا موقع حاصل ہو۔ اقبال نے مغرب میں نسلی اور لسانی قومیت کے تاریک پہلوؤں کا بغور مطالعہ کیا تھا اور اس نتیجے پر پہونچے تھے کہ جغرافیائی نسلی و لسانی وحدت ایک خود ساختہ اور مصنوعی شے ہے جسے مغربی استعمار نے اپنے مخصوص سیاسی اور معاشی مفادات کے تحفظ کے لئے جنم دیا ہے اور اصل وحدت فکری اور نظریاتی وحدت ہے اور اس لحاظ سے تمام دنیا کے مسلمان ایک ہی لڑی میں پروئے ہوئے دانوں کی مانند ہیں۔ مسلمانوں کو چاہیئے کہ اس وحدت سے باہر جانے کی کوشش نہ کریں، ؎

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے　　نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر

یہی وجہ ہے کہ جب مصطفےٰ کمال پاشا نے مقاریہ کی جنگ میں غیر ملکی قوتوں کے خلاف فتح حاصل کر کے ترکوں کی غیرت مندی اور بہادری کا لوہا دنیا سے منوایا۔ تو اقبال نے اپنے آپ کو اس فتح اور مسرت میں شریک سمجھا۔ چنانچہ ان کی مشہور نظم طلوع اسلام جو اس وقت زیر تبصرہ ہے اسی جنگ کے پس منظر میں لکھی گئی۔ اس سے قبل وہ اپنی دو اور معرکتہ الآرا نظموں "شمع اور شاعر" اور "خضر راہ" میں مسلمانوں کی غفلت پر نوحہ خوانی اور ممالک اسلامیہ کی زوال آمادہ روش پر تنقید کر کے ان کے زوال کے اسباب کی طرف اشارہ کر چکے تھے۔

اسی لئے ان دو مذکورہ نظموں میں کہیں کہیں ان کا لہجہ حزنیہ ہو جاتا ہے لیکن چونکہ وہ بنیادی طور پر حرکت و عمل اور امید کے پیامبر تھے اس لئے یہ حزن یاسیت سے نہیں بدلتا۔ مسلمانوں کو زوال زدہ دیکھ کر یہ حزنیہ کیفیت فطری طور پر ان کے اندر اس لئے پیدا ہوتی ہے کہ وہ مسلمانوں کے بہت بڑے ہمدرد تھے اور مسلمانوں کی حالت زار دیکھ کر ان کا دل بے چین

ہو جاتا تھا لیکن "طلوعِ اسلام" کا مجموعی تاثر رجائیت سے بھرپور ہے اس نظم کا پہلا ہی شعر اس کے آہنگ کا تعین کرتا ہے ۔

دلیلِ صبحِ روشن ہے ستاروں کی تنک تابی
افق سے آفتاب اُبھرا گیا دورِ گراں خوابی

اور اس میں ایک نشاطیہ لہر اوّل تا آخری جاری و ساری نظر آتی ہے اور دل گرفتگی ملال کی وہ ہلکی پرچھائیں جو شمع و شاعر اور خضرِ راہ پر پڑتی دکھائی دیتی ہے۔ طلوعِ اسلام میں کہیں نظر نہیں آتی۔ طلوعِ اسلام کا تاریخی پس منظر خضرِ راہ اور شمع و شاعر کے مقابلے میں بالکل جدا ہے۔

مصطفےٰ کمال کی کامیابی دراصل اقبال کے خوابوں کی تعبیر تھی۔ وہ مشرقِ وسطیٰ کے ممالک اور ہندوستان میں مسلمانوں کی زبوں حالی اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود مسلمانوں کے مستقبل سے مایوس نہیں تھے اور انھیں یقین تھا کہ مسلمان ایک بار پھر دنیا میں اپنا کھویا ہوا مقام دوبارہ حاصل کرلیں گے۔

چنانچہ شمع اور شاعر کا آخری بند ان کے انھیں خیالات کا آئینہ دار ہے جس کا پہلا شعر یہ ہے۔

اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش

اقبال کی شاعری کا ایک بڑا حصہ ملی اور اسلامی شاعری پر مشتمل ہے اور ان کی شاعری کا محور تعلیماتِ اسلامی اور احیائے ملت کا جذبہ ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ دنیا میں اسلام اپنی اصل صورت میں پیش کیا جائے اور مسلمان اس پر عمل پیرا ہوں۔ چنانچہ جب وہ مصطفےٰ کمال کی خبر سنتے ہیں تو بے اختیار اس کامیابی کو طلوعِ اسلام سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں اب اس دور کا آغاز ہو گیا ہے جس کا خواب وہ ایک عرصے سے دیکھ رہے تھے اور وہ مردِ مومن جو محض ایک شاعرانہ تصور تھا۔ اب اس کی عملی صورت نظر آنے لگی ہے۔

تو کرلیتا ہے یہ بال و پرِ روح الامیں پیدا
جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا ∴ نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

طلوعِ اسلام میں اگرچہ مسلمانوں کی فتح پر خوشی کا اظہار کیا گیا ہے اور اس فتح کے ہیرو کمال اتاترک کو خراجِ تحسین پیش کیا گیا ہے لیکن کہیں بھی اقبال نے اپنے مخصوص تصورِ فکر کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ نہ ایسا لگتا ہے کہ وہ خوشی سے بے قابو ہو کر جذبات کی رو میں بہہ گئے ہیں اور نہ ہی انھوں نے اپنے ممدوح کی شان بڑھانے کے لئے بیجا تعریف سے کام لیا ہے۔ حالانکہ وہ شاعرانہ مبالغے کی آڑ لے کر ایسا کر سکتے تھے لیکن انھوں نے پوری نظم میں کہیں بھی رسمی قصیدہ گوئی کا رنگ نہیں پیدا ہونے دیا بلکہ اپنے مخصوص طرزِ ادا میں اپنے ممدوح کی تعریف و توصیف بھی کی اور مستقبل کے لئے کچھ نصیحتیں بھی اس کے گوش گذار کیں۔ اس لئے کہ اقبال بڑی سے بڑی فتح کو بھی منزل قرار دینے کے لئے تیار نہ تھے۔ نیز وہ بھی یہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ اپنے مردِ مومن میں جن اوصاف کو دیکھنے کے خواہاں ہیں۔ وہ ان سے محروم ہو جائے۔

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے ∴ یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے

پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی ∴ ستارے جس کے گردِ راہ ہوں وہ کارواں تو ہے

مکاں فانی، مکیں آنی، ازل تیرا، ابد تیرا ∴ خدا کا آخری پیغام ہے تو جاوداں تو ہے

حنابندِ عروسِ لالہ ہے خونِ جگر تیرا ∴ تری نسبت براہیمی ہے معمارِ جہاں تو ہے

تری فطرت امیں ہے ممکناتِ زندگانی کی! ∴ جہاں کے جوہرِ مضمر کا گویا امتحاں تو ہے

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا ∴ لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

اس نظم میں اخوت کا درس دیتے ہوئے ایک جگہ کہتے ہیں ؎

تو رازِ کن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا ∴ خودی کا رازداں ہو جا خدا کا ترجماں ہو جا

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو — اخوت کا بیاں ہو جا، محبت کی زباں ہو جا

اقبال جانتے ہیں نسلی تفاخر کس طرح ملت کے لئے زہرِ ہلاہل کا کام کرتا ہے اس لئے خبردار کرتے ہیں ؎

یہ ہندی وہ خراسانی، یہ افغانی وہ تورانی — تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بیکراں ہو جا

غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے — تو اے مرغِ حرم اڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا

نظم کا چھٹا بند جس میں ترکوں کی کامیابی کا نقشہ کھینچا ہے اور یونانی اور انگریزی فوج کے کروفر کے مقابلے میں ترکوں کی بے سروسامانی کا ذکر کیا ہے۔ اقبال کے شاعرانہ کمال کی منہ بولتی تصویر ہے۔ خفیہ کمک، نظام سلکی، ٹیلیگراف اور ٹیلیفون اور آبدوز کشتیوں کا تذکرہ اس فنکارانہ نزاکت کے ساتھ کیا ہے کہ کم از کم اردو شاعری میں تو اس کی مثال کہیں نہیں ملتی۔

عقابی شان سے جھپٹے تھے جو بے بال و پر نکلے — ستارے شام کے خونِ شفق میں ڈوب کر نکلے

ہوئے مدفونِ دریا زیرِ دریا تیرنے والے — طمانچے موج کے کھاتے تھے جو بن کر گہر نکلے

غبارِ رہگذر ہیں کیمیا پر ناز تھا جن کو — جبینیں خاک پر رکھتے تھے جو اکسیر گر نکلے

ہمارا نرم رو قاصد پیامِ زندگی لایا! — خبر دیتی تھیں جن کو بجلیاں وہ بے خبر نکلے

غرض طلوعِ اسلام اقبال کی نمائندہ نظموں میں سے ایک ہے۔ شوکتِ الفاظ مضمون آفرینی اور نازک خیالی کے اعتبار سے یہ نظم بانگِ درا کی دوسری نظموں پر فوقیت رکھتی ہے اس نظم کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اپنے معنوی ربط اور باطنی تسلسل کے اعتبار سے ایک مکمل نظم ہونے کے باوجود اپنے لطیف استعاروں اور رمز و کنائے کی باریکیوں کی بدولت اس میں ایک خاص قسم رنگِ تغزل بھی پیدا ہو گیا ہے جس نے اس نظم کی دلکشی و رعنائی میں بے حد اضافہ کر دیا ہے۔

مجتبیٰ حسین

مسجد قرطبہ

نظم کا مرکزی موضوع جسے ایک تحریک کہنا زیادہ مناسب ہوگا، مسجد قرطبہ ہے۔ یہ مسلمانوں کی تاریخ کے ایک اہم دور کی نشاندہی کرتی ہے جو "خونِ مسلماں" کا امین ہے۔ اسی لئے اقبال کی نظر میں ہسپانیہ کی سرزمین "حرم" کی مانند "پاک" ہے۔ اور قرطبہ کی مسجد ایک یادگار ہی نہیں خود ایک تاریخ بن جاتی ہے جو سنگ و خشت سے لکھی گئی ہے۔

اس مسجد کے نقش و نگار میں ایک پورے تمدن اور اس کے شعور کی داستان چھپی ہوئی ہے، یہی داستان اقبال کی اس نظم میں آہستہ آہستہ ابھرتی ہے۔ مسجد قرطبہ دراصل ایک ذریعہ، ایک راستہ بن جاتی ہے، جو ہمیں اس داستان تک پہونچاتی ہے۔ نظم کے مختلف مدارج تک پہونچنے سے پہلے ہمیں ذرا دیر کے لئے اس بنیاد کو تلاش کرنا پڑے گا جس پر یہ پوری نظم تعمیر کی گئی ہے۔ چنانچہ بات کچھ اس طرح شروع ہوتی ہے کہ شاعر کے سامنے یہ مسجد ہے یا شاعر اس مسجد میں پہونچ جاتا ہے (اقبال یہاں نماز بھی پڑھ چکے ہیں) وقت سمجھ لیجئے کہ شام کا ہے جیسا کہ اس نظم کے ایک مصرعے سے پتہ چلتا ہے ؎

لعل بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا آفتاب

شام کا بڑھتا ہوا اندھیرا۔ ایک تاریخی مسجد اور ہسپانیہ کی سرزمین۔ یہ تمام چیزیں آقبال کے لئے ایک شدید تاثر پیدا کرنے کے لئے کافی ہیں، یہی تاثر اس کہانی کا سنگ بنیاد بن جاتا ہے۔ مسجد کی اس فضا میں جو صدیوں سے "بے اذاں" ہے اقبال کے ذہن میں مختلف نقوش اُبھرنے لگتے ہیں، اور وہ ایک ایسے دَور میں جا پہونچتے جس میں یہ مسجد تعمیر کی گئی تھی، یہ دَور ان کے خیالات اور جذبات کی مہمیز بن جاتا ہے، یادوں کے سلسلے صدیوں کے ورق اُلٹ دیتے ہیں اور اب یہ مسجد ایک قوم کی جانفشانی اس کے ذوق عبودیت اور اس کے تصور حیات کی جیتی جاگتی علامت بن جاتی ہے۔ یہ یادیں اس دَور سے وابستہ ہیں جو ماضی بن چکا ہے۔ ماضی کا یہی احساس، یادوں کا یہی سلسلہ وقت سے جا کر مل جاتا ہے جو اب شاعر کی نگاہ کو مسجد اور اس کے تعمیر کرنے والوں کی تاریخ سے ہٹا دیتا ہے اور صرف اپنے تصور میں گم کر دیتا ہے شاعر کے پیش نظر اب صرف وقت رہ جاتا ہے جس نے تاریخ کو بھی ایک یاد بنا دیا ہے۔ وقت جو ماضی بھی ہے اور مستقبل بھی۔ اور جو کچھ بھی نہیں ہے، صرف وقت ہے۔ وقت کے اس بے پایاں دھندلکے میں گرد و پیش گم ہو کر رہ جاتے ہیں۔ یہ ایک کبھی نہ ٹوٹنے والا سلسلہ ہے ؎

سلسلۂ روز و شب نقش گر حادثات — سلسلۂ روز و شب اصل حیات و ممات
سلسلۂ روز و شب تار حریر دو رنگ — جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات
سلسلۂ روز و شب ساز ازل کی فغاں — جس سے دکھاتی ہے ذات زیر و بم ممکنات
تجھ کو پرکھتا ہے یہ مجھ کو پرکھتا ہے یہ — سلسلۂ روز و شب، صیرفیٔ کائنات

وقت کا یہ خوفناک تسلسل شہر کو بیابانوں میں۔ اور بیابانوں کو شہروں میں بدلتا رہتا ہے اور تخریب و تعمیر کی منزلوں سے گذر کر ہمیشہ ایک نئی منزل کی طرف بڑھتا ہے۔ اس

تسلسل سے ہر شے ہے۔ مگر یہ تسلسل کسی شے سے نہیں ہے، نظم وقت کے اسی عظیم اور ایک حد تک مہیب تصور کے ساتھ "کھلتی" ہے اور ایک ندی کی طرح بہنے لگتی ہے "سلسلہ روز و شب کی کی تکرار تند موجوں کے تھپیڑوں میں بدل جاتی ہے، جس کی آواز آس پاس کی آوازوں کو ڈبو دیتی ہے، یہ وقت کی آواز ہے "سلسلہ روز و شب" کی تکرار ہمیں یونانی ڈراموں کے کورس کی یاد دلاتی ہے اور کوئی تعجب نہیں کہ اقبال کے ذہن میں اس نظم کی فنی تشکیل کے وقت یونانی ڈراموں کے کورس بھی رہے ہوں گے۔ بہر حال بات کچھ بھی ہو شاعر وقت کی کارفرمائیوں کا ایک تصور اور تاثر پیدا کرنا چاہتا ہے، جسے یہ تکرار شدید سے شدید تر بناتی جاتی ہے۔ اُردو کی کم ہی نظمیں ایسے "اچانک پن" کے ساتھ شروع ہوتی ہیں۔ نظم کے پہلے ہی مصرعے کے بعد ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ ہم دفعتاً ایک پرشور دریا کے کنارے آ کھڑے ہوئے ہیں جس کی روانی ہر آنے والے مصرعے کے ساتھ تیز تر ہوتی جاتی ہے اور جس کے بہاؤ میں کائنات کی ہر شے بہتی چلی جاتی ہے، نظم کی اس روانی کے ذریعے سے شاعر نے وقت کی روانی کو بڑے فن کارانہ اور موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ وقت کی روانی کا تصور تقریباً مجرد ہے جو دنیا کے ہر تغیر سے بے نیاز ہے ؎

ایک زمانے کی رو جس میں نہ دن ہے نہ رات

اس سفاک وقت کے سامنے تمام تدابیر اور افعال بے حقیقت نظر آنے لگتے ہیں ؎

آنی و فانی تمام معجزہ ہائے ہنر　　کارِ جہاں بے ثبات، کارِ جہاں بے ثبات
اول و آخر فنا، باطن و ظاہر فنا　　نقش کہن ہو کہ نو منزل آخر فنا

یہاں پہونچ کر وقت ایک "جبر" بن جاتا ہے جس کی زد میں ہر شے ہے اور جو خود کسی کی زد میں نہیں، ایک ویرانی کا احساس ذہن پر طاری ہونے لگتا ہے۔

اب آگے بڑھنے سے قبل ذرا ایک بار پھر نظم کی ان کڑیوں کو ملا لیجئے جنھوں نے

ہمیں اس موڑ تک پہونچایا ہے، شاعر کے سامنے پہلے مسجد قرطبہ تھی، پھر مسجد قرطبہ نے ایک تاریخ یادوں کی مخملی تہ میں لپیٹ کر پیش کر دی، اور یہ تاریخ آگے بڑھ کر وقت کے ویرانے میں کھو گئی۔ اب اور کوئی چیز نہیں رہ گئی ہے۔ صرف وقت ہے جس سے پوری کائنات عبارت ہے ساری چیزیں اسی "وقت" کا مظہر ہیں، وقت کے اس مجرد تصور کو پیش کرنا شاعری اور ادراک دونوں کی بڑی کٹھن منزل تھی۔

اقبال ایک منزل شناس کی طرح یہاں سے گذرے ہیں۔ ہر لفظ خیال اور خیال لفظ بن کر نظم کو آگے بڑھاتا رہتا ہے اور پھر نظم اس موڑ پر آجاتی ہے جس کے آگے صرف ویرانہ ہے۔ اس ویرانی میں انسانی دلچسپی پیدا کرنے کے لئے شاعر کو وقت کی وہ کڑیاں، وہ چند لمحے تلاش کرنے پڑتے ہیں جن میں زندگی اب تک مقید ہے اور جن سے ایک تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے۔

چنانچہ جب یہ کڑیاں جنھیں وہ ماضی کی یادوں کے ذریعے سے تلاش کرتا ہے مل جاتی ہیں تو وقت کے اس ویرانے میں چند اور تصویریں متحرک نظر آنے لگتی ہیں اور شاعر کی اس آواز میں جو نا امیدی پر ختم ہوتی نظر آتی ہے ایک یقین اور اعتماد سا نظر آجاتا ہے، جبر و اختیار میں تبدیل ہونے لگتا ہے اور انسانی زندگی اتنی کم مایہ نہیں معلوم ہوتی ہے جتنی پہلے معلوم ہوتی تھی ؎

ہے مگر اس نقش میں رنگ ثبات دوام — جس کو کیا ہے کسی مرد خدا نے تمام

خواجہ حافظ نے اس موقع کے لئے کیا خوب کہا ہے ؎

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق — ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

اقبال کے مرد خدا کا خمیر بھی عشق سے اٹھا ہے ؎

مردِ خدا کا عمل، عشق سے صاحبِ فروغ　　عشق ہے اصلِ حیات، موت ہے اس پر حرام

عشق کے "اصلِ حیات" ہو جانے کے بعد کائنات کے جملہ مظاہر لازماً عشق میں ڈھلنے لگتے ہیں اور سرکش اور مہیب وقت بھی عشق کی گرفت میں آکر اپنی قہرمانی کھو دیتا ہے ؎

تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رَو　　عشق خود اک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام

اور

عشق دمِ جبرئیل، عشق دلِ مصطفےٰ　　عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام

اب وقت کی جگہ عشق کائنات پر محیط ہو جاتا ہے اور ہر چیز اس کے سانچے میں ڈھل جاتی ہے۔ چنانچہ مسجدِ قرطبہ کا وجود بھی عشق ہی کا رہینِ منت ہو جاتا ہے ؎

اے حرمِ قرطبہ، عشق سے تیرا وجود　　عشق سراپا دوام، جس میں نہیں رفت و بود

اس منزل پر آکر نظمِ وقت کے دیرانے سے یکسر نکل آتی ہے اور فکر و ہیئت دونوں کے خوشگوار اور متوازن امتزاج کے ساتھ تعمیر کی طرف ایک اور قدم بڑھاتی ہے اب اس راہ میں تاریخی عوامل سے شاعر کام لیتا ہے جو عشق کے پابند ہیں اور خود یہ عشق "سینۂ آدم" میں پنہاں ہے، اس لئے ؎

عرشِ معلّیٰ سے کم سینۂ آدم نہیں

اس تصویر میں جو شروع میں وقت کے ویرانے سے بنائی گئی تھی اب "آدمی" حرکت کرنے لگتا ہے اور تصویرِ ذی روح ہو کر بول اٹھتی ہے، یہ آدمی اقبال کا وہ تصورِ حیات ہے، جسے وہ "مردِ مومن" کے نام سے پکارتے ہیں۔ یہ "مردِ مومن" مسجدِ قرطبہ کی خاموش اور افسردہ فضا میں ان کے سامنے تمام جلال و جمال کے ساتھ ایک تمدن کی داستان کہتا نظر آتا ہے ؎

تجھ سے ہوا آشکار بندۂ مومن کا راز　　اس کے دنوں کی تپش، اس کی شبوں کا گداز

اس کا مقامِ بلند، اس کا خیالِ عظیم　　اس کا سرور اس کا شوق اس کا نیاز اس کا ناز

اقبال نے اس مردِ مومن کے اوصاف بڑے دلکش انداز میں پیش کئے ہیں ؎

اس کی اُمیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل　　اس کی ادا دلفریب اس کی نگہ دل نواز

نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو　　رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاک باز

وہ اس مردِ مومن کو "عقل کی منزل" اور "عشق کا حاصل" دونوں بتلاتے ہیں۔ مسجدِ قرطبہ بھی اسی مردِ مومن کی کاوشوں اور جذبۂ عشق کا ایک نشان ہے۔ اسی لئے اب ساری تاریخ، ساری یادیں مسجد قرطبہ میں سمٹ آتی ہیں۔ ماضی کی یادیں شاعر کی فکر کو ایک ایسے شاعرانہ جذبے میں بدل دیتی ہیں جو "غزلوں" کے پیچھے کارفرما ہوتا ہے، شاعر کو مسجد قرطبہ سے عشق ہو جاتا ہے اور یہ مسجد اس کے لئے سراپا "غزل" بن جاتی ہے، یہ غزل اس تمدن کے عشق کی داستان ہے جس کی "رازداں" یہ ہسپانوی مسجد رہ گئی ہے اور اب شاعر کی نگاہ ایک بار پھر مسجد قرطبہ پر مرکوز ہو جاتی ہے اور باقی تمام چیزیں نظروں سے اُوجھل ہو جاتی ہیں۔ اس مسجد کی تعمیر میں اب وہ ان لوگوں کے ہاتھ دیکھتا ہے ؎

جن کے لہو کے طفیل آج بھی ہیں اندلسی　　خوش دل و گرم اختلاط سادہ و روشن جبیں

اور

آج بھی اس دیس میں عام ہے چشم غزال　　اور نگاہوں کے تیر آج بھی ہیں دل نشیں

بوئے یمن آج بھی اس کی ہواؤں میں ہے　　رنگ حجاز آج بھی اس کی نواؤں میں ہے

یہاں پہونچ کر اقبال کی فکر نظم کے تدریجی ارتقاء کے ساتھ ساتھ تکمیل کی آخری منزل پر آجاتی ہے۔

اس نظم کی فنی صناعی اور فکری تعمیر کو اقبال نے خود مسجد قرطبہ کی صناعی اور حسنِ تعمیر سے

جس طرح ہم آہنگ کر دیا ہے وہ ہمارے ادب میں موضوع اور فکر کے داخلی اور خارجی ارتباط کی کمیاب مثال ہے۔ اقبال ہر لفظ کو اس طرح مصرعوں میں رکھتے گئے ہیں جس طرح ایک ماہر معمار ایک پتھر کے بعد دوسرا پتھر بٹھاتا ہے۔ نظم کی تعمیر کے ساتھ ساتھ قاری مسجد کو بھی تعمیر ہوتے ہوئے دیکھنے لگتا ہے۔ اپنے موضوع ہی کی طرح نظم بھی ارتقائی منزلیں طے کرتی رہتی ہے اور اب وہ اس جگہ آجاتی ہے جہاں شاعر مسجد قرطبہ کو دیکھتے دیکھتے پھر وقت کے بے پایاں دھندلکے میں کھو جاتا ہے۔ یادوں کا وہ سلسلہ جو اس مسجد سے وابستہ ہے اسے قوموں کے عروج و زوال اور نوبہ نو انقلاب سے دوچار کر دیتا ہے۔ خیالات کی یہ رو اسے پھر "وقت" کے دریا کے کنارے لا کھڑا کرتی ہے۔ اب ہر چیز پھر وقت بن جاتی ہے، جس کی آغوش میں ماہ و سال انسانی کاوشوں اور کوششوں کو کامیاب اور ناکامیاب بناتے رہتے ہیں۔ کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا کہ کیا ہونے والا ہے۔

دیکھئے اس بحر کی تہ سے اُچھلتا ہے کیا
گنبدِ نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا

یہ ایک سوال ہے جہاں اقبال تاریخی مطالعے اور شاعرانہ بصیرت کے ذریعے سے پہونچے ہیں۔ یہ سوال دراصل وقت کے لبوں سے پھوٹا ہے جس کا جواب بھی وقت ہی ہے، یہاں آکر نظم تکمیل تک پہونچ جاتی ہے۔

اب ایک بار مڑ کر اس راستے پر پھر نظر دوڑائیے جس سے چل کر نظم یہاں تک پہونچی ہے۔

پوری نظم اس سفر میں اپنے تین مراحل سے گذرتی ہے۔ پہلے مرحلے کی ابتدا مسجدِ قرطبہ سے ہوتی ہے، جو اپنے ساتھ تاریخ یا تاریخی یادیں لاتی ہے۔ یہ مرحلہ اگرچہ نظم میں نہیں پیش کیا گیا ہے لیکن نظم کا پس منظر اسی سے تیار ہوا ہے۔ یہ تاریخ جو مسجدِ قرطبہ پیش کرتی ہے وقت کی تند و تیز موجوں میں کہیں بہہ جاتی ہے۔

دوسرے مرحلے کی ابتدا (جہاں سے نظم شروع ہوتی ہے) وقت کے تصور اور اسکی "ہمہ گیری" سے ہوتی ہے۔ اس "وقت" کے دامن میں سب کچھ ہے، تمام تاریخیں انسانی زندگی کی تمام سعی و جستجو۔ چنانچہ یہ وقت ایک مخصوص تاریخ کو جنم دیتا ہے اور یہ مخصوص تاریخ مسجد قرطبہ بن کر ابھرتی ہے جس کے توسل سے شاعر ان لوگوں کو دیکھ لیتا ہے جنھوں نے ہسپانیہ کی سرزمین کو ایک نئے تصور حیات اور تمدن سے روشناس کرایا تھا۔

آخری مرحلے پر پہونچ کر نظم میں پھر وقت کے سوا اور کوئی چیز باقی نہیں رہ جاتی بس شام کا ایک دھندلکا ہے اور کچھ بھی نہیں ؎

وادیٔ کہسار میں غرق شفق ہے سحاب　　لعل بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا آفتاب

اس نیم تاریکی میں وقت کی ندی بہتی ہے ؎

آب رواں کبیر، تیرے کنارے کوئی　　دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب

یہاں بھی خواجہ حافظ بے اختیار یاد آجاتے ہیں ؎

بنشیں بر لب جوئے و گذر عمر ببیں

شاعر "آب رواں کبیر" کے کنارے بیٹھا "گذر عمر" دیکھ رہا ہے۔ تاریخ گذر رہی ہے۔ وقت گذر رہا ہے اور ایک نیا عالم طلوع ہو رہا ہے۔ اس لئے کہ وقت کا ہر لمحہ ایک نیا پیام ہے۔ اقبال اس پیام کے لئے گوش برآواز ہیں، ان کی دیدہ وری مستقبل کے دھندلکوں کو پار کر کے ایک نئی زندگی کو پار ہوتے ہوئے دیکھنے لگتی ہے ؎

عالم نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں　　میری نگاہوں میں ہے اس کی سحر بے حجاب

نظم کی یہ آخری منزل ہے جو ایک پر یقین لہجے پر ختم ہوتی ہے، اس یقین کو حاصل کرنے کے لئے اقبال، ماضی حال اور یہاں تک کہ مستقبل کی پیچیدہ راہوں سے گذرے ہیں مستقبل سے

وہ اس لئے مایوس نہیں ہیں کہ وہ زمانہ حال میں ایک "شدید اضطراب" اور "کشمکش" پاتے ہیں جو آنے والے انقلاب کا پتہ دیتی ہے۔ اقبال اس انقلاب کے لئے اس لئے چشم براہ ہیں کہ انھوں نے ماضی کی تاریخ میں انسان کو مجبور نہیں مختار پایا ہے اور دیکھا ہے۔ وہ پرامید ہیں۔ یہی امید وقت کی بھیانک تاریکی میں روشنی بن جاتی ہے جو پوری نظم میں پائی جاتی ہے جو ہر لفظ سے پھوٹتی ہے اور نظم کو ایک عمل اور روشنی کی تخلیق میں بدل دیتی ہے۔

یہ تو ہوئی اس نظم کی فکری اور فنی تشکیل جو ایک ایسی اکائی بن کر ابھرتی ہے کہ قاری کے ذہن میں کہیں بھی کوئی انتشار یا بے آہنگی کا احساس نہیں پیدا ہوتا۔ پوری نظم میں ایک مصرع بھی ایسا نہیں ہے جو اپنے متعینہ مفہوم یا موضوع سے دور جا پڑا ہو اور قاری کے خیالات اور جذبات کی رو ایک جھٹکے کے ساتھ رک جائے۔

اب ایک دو لفظ نظم کی ادبی خوبی کے بارے میں بھی۔ یہ ادبی خوبی کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو شاعر کے فکری اور فنی اتصال سے ہٹ کر ہو لیکن اپنی آسانی کے لئے ہم اس طرف بھی اگر ایک اچٹتی سی نظر دوڑا لیں تو اس نظم کی خوبی کو سمجھنے میں اور مدد مل سکتی ہے۔ لب و لہجہ شروع ہی سے بڑے وقار اور سنجیدگی کا حامل ہے۔ انداز بیاں میں ایک ایسا توازن پایا جاتا ہے جو نظم کے مزاج سے کہیں بھی میل نہیں ہونے پاتا۔ یہ سنجیدگی اور توازن قاری کو موضوع کی اہمیت اور اس کی بلندی سے آگاہ کرتی رہتی ہے۔ بعض اوقات ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعر الفاظ کے دروبست سے قصداً ایک کھردرے پن کا احساس پیدا کرنا چاہتا ہے تاکہ مسجد کی تعمیر لفظوں کے ذریعے سے نمایاں ہو سکے۔ بالخصوص نظم کے اس حصے میں جہاں مسجد کی ظاہری شباہت کا ذکر ہے اقبال نے لفظوں سے سنگ تراشی کا کام لیا ہے۔ اس کے علاوہ نظم میں ہمیں کئی اور بھی آثار

سادگی سی پائی جاتی ہے۔ جو اپنی جگہ موضوع کی شعریت کو دل نشیں کرتی جاتی ہے۔ اقبال نے لفظوں کے استعمال میں بڑی احتیاط اور کفایت شعاری سے کام لیا ہے۔ اعتدال اور تناسب کا خیال اس نظم میں اس قدر ہے کہ تشبیہہ اور استعاروں کے استعمال میں بھی اقبال نے کسی غیر متوازن تاثر آفرینی یا مبالغہ آمیزی کو راہ نہیں دی ہے۔ اس لئے نظم ایک ایسے موضوع پر ہوتے ہوئے بھی جس سے شاعر کو والہانہ عشق ہے نری جذباتیت سے بچ گئی ہے اور پڑھنے والے کو خواہ وہ اقبال کے نقطۂ نظر سے اتفاق کرے یا اختلاف شاعر کے خلوص کا احترام کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ اس توازن، سنجیدگی اور ایک حد تک کھردرے پن سے شعریت میں کوئی کمی نہیں واقع ہوتی بلکہ ہر چیز ایک ایسی تقویت پہونچاتی ہے جو نظم کے حسن کو اُردو ادب میں ہمیشہ برقرار رکھے گی۔ اس میں ایک صلابت کا حسن ہے جو رنگین بیانی کے ذریعے سے اُبھارا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ تمدن کی جو کہانی اس نظم میں بیان کی گئی ہے اس میں غلط قسم کی رنگین بیانی مصرعوں کی فکری نغمگی کو کمزور کر کے اس کہانی کی فضا کو بے اعتبار کر دیتی۔ اس کہانی کے تین کردار ہیں، شاعر، مسجد قرطبہ اور وقت، جو تاریخ بھی بن جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان تینوں کرداروں سے کام لینے اور ان میں ربط نہاں پیدا کر کے ایک کامیاب تاثر پیدا کرنے کے لئے کسی "خالص شاعرانہ" اپج سے کام بگڑ جاتا اور نظم سب کچھ بن جاتی مگر مسجد قرطبہ کی لفظی اور معنوی تصویر نہ بن سکتی، اقبال نے پورے شعوری طور پر موضوع کے ان مطالبات کو پیش نظر رکھا ہے اور پھر قلم اٹھایا ہے۔ اس لئے یہ نظم نہ صرف اقبال کی نظموں بلکہ اُردو کی دوسری بلند پایہ نظموں میں سے ایک انفرادی شان رکھتی ہے۔

مولانا ابوالحسن ندوی

طارق کی دُعا

تازہ دم اور جواں سال طارق بن زیاد جب عربی فوجوں کے ساتھ اُندلس میں اُترا تو اپنی فوج کے ان سفینوں کو جلا ڈالنے کا حکم دے دیا جن کے ذریعے اس کے لشکر نے دریا عبور کیا تھا اور یہ اس لئے کیا تھا کہ مسلم فوجوں کو پھر بھاگنے اور واپس ہونے کا خیال بھی نہ رہے، جلانے کے بعد اس نے اپنے یادگار تاریخی خطبے میں کہا "ایہا الناس این المفر، البحر من ورائکم، والعدو امامکم ولیس لکم والله الا الصدق والصبر" لوگو! راہِ فرار کوئی نہیں، سمندر تمھارے پیچھے اور دشمن تمھارے سامنے ہے، اب خدا کی قسم صبر و ثبات، اور سچے مجاہدانہ ذوق و شوق کے سوا تمھارا کوئی ساتھی نہیں ——— اس شعلہ نوائی نے فوج کو دل و جان سے تیار کر دیا اور اللہ تعالیٰ کے بعد اپنے بازوؤں اور تلواروں پر ان کا بھروسہ پختہ ہو گیا۔

طارق نے دشمن کے مقابلے پر صف بندی کے بعد اپنی فوج کا معاینہ کیا تو اسے معلوم ہوا کہ اسپینی فوج سے عددی طاقت اور فوجی قوت میں وہ بدرجہا کمتر ہے، اور کسی رسد اور کمک کی بھی امید نہیں دشمن اپنے ملک میں ہے، وہ ہر وقت اپنی طاقت بڑھا سکتا ہے،

لیکن اسلامی فوج غریب الدیار اور اپنے مرکز سے سینکڑوں میل دور ہے، اس لئے کسی بیرونی مدد کا سوال ہی نہیں اٹھتا، اگر چھینے ہوئے ہتھیار کچھ کام دے سکیں تو خیر ورنہ کسی کی خیر نہیں، اس روح فرسا صورت حال نے طارق کے دل میں قدرتی طور پر تشویش، اندیشے، اور اضطرابی کیفیت پیدا کی اور اسے کوئی تدبیر سوچنے پر مجبور کر دیا، مگر بالآخر اسے ایک ہی حیلہ سمجھ میں آیا کہ فوج کی روحانی طاقت اور ایمانی صلاحیت کو بڑھا کر وہ الٰہی مدد حاصل کی جائے جو ناقابل تسخیر اور غیر مغلوب ہے، تائیدِ غیبی پر طارق نے بھروسہ کیا اور یقین کر لیا کہ وہ اس کے ساتھ ہے کیونکہ اسے اپنے مؤقف کی صداقت وحقانیت پر پورا اطمینان تھا کہ یہ فوج حزب اللہ اور جنود الرحمٰن ہے، یہ ملک گیری، جوع الارض کی تسکین اور اپنا اقتدار منوانے کے لئے نہیں نکلی ہے، بلکہ صرف "اعلائے کلمۃ اللہ" اور حق وصداقت کو سربلند کرنے کے لئے آئی ہے، وہ اس لئے سر ہتھیلی پر لے کر نکلے ہیں کہ لوگوں کو تاریکی سے روشنی کی طرف، انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے نکال کر خدا کی بندگی کی طرف، دنیا کے تنگنائے سے وسعتِ آفاق کی جانب اور مذاہب کے ظلم وستم سے بچا کر اسلام کے عدل واعتدال کی سمت رہنمائی کرے، اللہ تعالیٰ نے اس مقصد سے معرکہ آرا ہونے والوں کی فتح وظفر کا وعدہ کیا ہے
"وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغَالِبُوْنَ"

اس موقع پر مسلمان کمانڈر نے اپنے رب سے دعا کی اور اس کی مدد کا طالب ہوا مسلمان قائد اس وقت رسولِ اعظم صلے اللہ علیہ وسلم کی اتباع کر رہا تھا جنھوں نے پہلی اسلامی فوج کی قیادت کی تھی، اور بدر کے میدان میں صف آرائی کے بعد خلوتِ عریش میں جا کر اور سجدے میں گر کر اپنے خدا سے رو رو کر عرض کیا۔ "اللھم ان تھلک ھذہ العصابۃ الیوم لن تعبد" (اے خدا اگر یہ جماعت آج ہلاک ہوگئی تو پھر دنیا میں تیری عبادت نہ ہو سکے گی)۔

چنانچہ طارق نے اپنے پیغمبرؐ اور اپنے سردار کی تقلید کرتے ہوئے ایسی دُعا مانگی جسے عام طور پر قائد اور فاتح نہیں مانگا کرتے اور نہ کسی کو اس کا خیال ہی آتا ہے۔ اقبال نے اس عروسِ جمیل کو لباس حریر پہنا کر اور دلآویز بنا دیا ہے، طارق نے اپنی دُعا میں کہا کہ ——

—— اے خدا! یہ بندے جو تیرے راستے میں جہاد کے لئے نکلے ہیں، اور تیری رضا ڈھونڈتے ہیں، یہ پراسرار بھی ہیں اور صاحب اسرار بھی ہیں، ان کی حقیقت اور ان کا مقام تیرے سوا کوئی نہیں جانتا، تو نے انھیں عالی ہمتی اور بلند پروازی سکھائی ہے اس لئے وہ عالمی سیادت اور عالمگیر حکومت الٰہیہ سے کم پر راضی نہیں ہوں گے، یہ بطل غیور وہ ہیں، جو تیرے سوا کسی سے نہیں دبتے اور کسی کی نہیں سنتے، صحرا و دریا ان کی ٹھوکروں کے اشارے پر چلتے ہیں اور ان کی ہیبت اور رعب و دبدبہ سے پہاڑ بھی گرد ہو جاتے ہیں۔ تو نے انھیں اپنی محبت کا آشنا بنا کر دو عالم سے بیگانہ بنا دیا، ذوق شہادت اور شوق جہاد کے سوا دنیا اور دنیا کی حکومت بھی ان کے لئے کوئی چیز نہیں اور محبت دل میں گھر کرنے کے بعد یہی کچھ کرتی ہے۔ یہی ایک دُھن ہے، جو انھیں اس دور دراز ملک تک لے آئی ہے، یہ لگن مومن کی آخری خواہش اور سب سے بڑی آرزو ہوتی ہے۔

دنیا ہلاکت کے دہانے اور تباہی کے غار پر کھڑی ہے، انھیں اس میں گرنے سے عرب اپنی جان دے کر اور خون بہا کر ہی بچا سکتے ہیں، دنیا عربوں کے اس پاک خون کے لئے ہمہ تن چشم انتظار ہے، جو ہزار بلاؤں کو ٹالنے والا اور ہزار بیماریوں کے لئے پیام شفا ہے" خیاباں و بیاباں میں لالہ و گل اسی سرخ خون کے منتظر ہیں کہ اسے اپنا غازۂ رخسار بنائیں ہم اس سرزمین میں اسی لئے آئے ہیں کہ اپنے جسم و تن کا بیج بوئیں اور خونِ دل سے اس کی آبیاری کریں تاکہ انسانیت کی مرجھائی ہوئی کھیتی لہلہانے لگے اور خزاں کے طویل

عہد کے بعد بہادیں لوٹ آئیں :۔

یہ غازی یہ تیرے پراسرار بندے — جنھیں تو نے بخشا ہے ذوقِ خدائی
دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا — سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی
دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو — عجب چیز ہے لذتِ آشنائی!
شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن — نہ مالِ غنیمت، نہ کشور کشائی
نیاباں میں ہے منتظر لالہ کب سے — قبا چاہیئے اس کو خونِ عرب سے

اے خدا! تو نے صحرا نشینوں اور اونٹوں کے چرواہوں پر اپنے وہ مخصوص انعام کئے جس میں ان کا کوئی شریک نہیں۔ تو نے انھیں، نیا علم، نیا ایمان اور نیا طرزِ زندگی بخشا، تو نے انھیں اذانِ سحر کی دولت دی جو علمِ صحیح، ایمانِ قوی اور ذوقِ سلیم سے عاری، دنیا میں توحید کی کھلی دعوت ہے، جو لوگوں کو غفلت و جہالت کی نیند سے بیدار کرتی ہے، عربوں نے اس کے سہارے دنیا پر چھائے ہوئے موت کے سناٹے کو توڑا اور اندھیروں میں ڈوبی ہوئی دنیا کو صبحِ نو کی بشارت دی، زندگی نے حرکت و حرارت کھو دی تھی، اور اس کی محرومی پر صدیاں گذر چکی تھیں، بالآخر اس نے عربوں کے سوز و دروں اور جگر لخت لخت سے اپنے نئے سفر کا آغاز کیا اور ایمان و محبت کو حاصل کیا، یہ مجاہد موت کو زندگی کی انتہا اور جان کا زیاں نہیں سمجھتے بلکہ اسے نئی زندگی کا فتح باب اور عیشِ تازہ کا سامان جانتے ہیں، یارب! امتِ مومنہ کو پھر ایمانی حمیت اور بغض فی اللہ دے جس کا ظہور دعائے نوح میں ہوا تھا کہ انھوں نے دل برداشتہ ہو کر کہا تھا: "رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكَافِرِينَ دَيَّارًا" تاکہ یہ فوج عالمِ کفر و فساد کے لئے برقِ صاعقہ فگن بن جائے انھیں عزم و یقین دے اور لوگوں میں ان کا وہ رعب قائم فرما کہ ان کی نگاہ، سپاہ اور ان کی للکار، تلوار بن جائے :۔

کیا تو نے صحرا نشینوں کو یکتا! | خبر میں، نظر میں، اذانِ سحر میں
طلب جس کی صدیوں سے تھی زندگی کو | وہ سوز اس نے پایا انھیں کے جگر میں
کشادِ درِ دل سمجھتے ہیں اس کو | ہلاکت نہیں موت ان کی نظر میں
دلِ مردِ مومن میں پھر زندہ کر دے | وہ بجلی کہ تھی نعرۂ لاتذر میں!
عزائم کو سینوں میں بیدار کر دے | نگاہِ مسلماں کو تلوار کر دے

اس مومن و مخلص قائد کی دعا قبول ہوئی اور اسلامی فوج اپنے اس دشمن کے مقابلے میں کامیاب ہوئی جو طاقت اور عددی اکثریت میں اس سے کئی گنا بڑا تھا اور عیسائی اندلس، اسلامی اور عربی اندلس بن گیا اور مسلمانوں کی وہ پائیدار حکومت قائم ہوئی جو صدیوں تک رہی اور پھر اس کا خاتمہ اسی وقت ہوا جب طارق اور اس کے ساتھیوں کی روح ان میں باقی نہیں رہی اور وہ نصب العین یاد نہیں رہا جو انھیں یہاں تک لایا تھا، جذبہ ایمانی کا فقدان. طاؤس ورباب کے مشاغل اور خانہ جنگیوں نے حکومت کے ساتھ ہی مسلمانوں کا وجود یہاں تک خطرے میں ڈال دیا کہ ایک متنفس بھی باقی نہ رہا، غافلوں اور خود فراموشوں کے ساتھ خدا کا ہمیشہ یہی معاملہ رہا ہے "وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا".

صفی حیدر دانش

ذوق و شوق

شاعرِ مشرق علامہ اقبال کی اُردو نظموں میں "ذوق و شوق"، بعض خوبیوں کے سبب سے ایک ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ یہ نظم جو ان کی چند دوسری نظموں کی طرح ترکیب بند کی شکل میں ہے ان کے مجموعۂ کلام "بالِ جبریل" میں شامل ہے۔ اس نظم میں پانچ بند ہیں اور اشعار کی مجموعی تعداد تیس ہے۔ اس لئے اس کو اقبال کی طویل نظموں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ "ذوق و شوق" کا موضوع نعتِ رسولؐ پاک ہونے کے سبب سے انتہائی رفیع اور پاکیزہ ہے۔ اس نظم میں شاعر نے عشقِ رسولؐ کا اظہار جس جوش اور خلوص سے کیا ہے وہ ایک خصوصیت رکھتا ہے۔ اس میں شاعر کی نوا نے اس کے خون دل و جگر سے پرورش پائی ہے۔ یہاں "رگِ ساز میں صاحبِ ساز کا لہو" دوڑا ہوا ہے۔ جذبات کی شدت اور فنی محاسن نے اس نظم کے اشعار میں تاثیر کا ایسا طلسم بھر دیا ہے کہ "ذوق و شوق" درحقیقت اسم بامسمیٰ معلوم ہوتی ہے۔

"ذوق و شوق"، جسے اقبال کی نعتیہ شاعری کا ایک شاہکار کہا جاسکتا ہے ان کی زندگی کے آخری زمانے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس دور میں ان کا دل عشقِ رسولؐ سے سرشار تھا اور ان کا فن بھی انتہائی بلندیوں تک پہونچ چکا تھا۔ اقبال ایک سچے اور پرجوش مسلمان تھے وہ ان لوگوں

میں سے تھے جن کے دل مدینۂ منورہ کی زیارت کے لئے بے قرار رہے ہیں۔ اقبال کو روضۂ رسول کی زیارت کا شدید اشتیاق تھا۔ اس ارمان نے ان کو زندگی بھر بے چین رکھا۔ لیکن اس کی تکمیل ان کے مقدر میں نہیں تھی۔ وہ اپنے انتہائی ذوق و شوق کے باوجود دیارِ حبیبؐ تک نہیں پہونچ سکے۔ چنانچہ اسی ذوق و شوق کی شدت اس نظم کی تخلیق کا سبب بنی اور انھوں نے اس کو "ذوق و شوق" کا نام دے کر اپنے شوقِ زیارت کی ایک مؤثر اور یادگار تصویر اس نظم میں پیش کر دی ہے۔

"ذوق و شوق" کے پہلے بند میں چھ اشعار ہیں۔ یہ بند اس نظم میں تمہیدی حیثیت رکھتا ہے۔ بند شروع ہونے سے پہلے یہ نوٹ دیا ہوا ہے کہ ان اشعار میں سے اکثر فلسطین میں لکھے گئے اور اس کے نیچے سعدی شیرازی کا یہ شعر ہے ؎

دریغ آمدم زاں ہمہ بوستاں　　تہی دست رفتن سوئے دوستاں

یعنی اس جگہ سے آتے ہوئے جو بوستاں ہے میں نے یہ بات پسند نہیں کی کہ دوستوں کے پاس خالی ہاتھ یعنی کوئی تحفہ لئے بغیر جاؤں۔ یہاں اس کا یہ مطلب ہوا کہ اقبال فلسطین سے اس نظم کو تحفہ کے طور پر لے کر اپنے وطن کو واپس آ رہے ہیں۔

پھر پہلا بند اس شعر سے شروع ہوتا ہے ؎

قلب و نظر کی زندگی دشت میں صبح کا سماں　　چشمۂ آفتاب سے نور کی ندیاں رواں

شاعر یہ بتانا چاہتا ہے کہ وہ عالمِ خیال میں نواحیٔ مدینہ میں موجود ہے۔ اس کا دل اس ارضِ پاک میں ہے اور وہ وہاں کے مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ یہ منظر نگاری کا ایک دل کش اور کامیاب نمونہ ہے۔ اس میں اقبال نے مدینۂ منورہ کے آس پاس کے ایک نورانی پاکیزہ اور دل کش صبح کا منظر بیان کیا ہے۔ وہ ایک ایسی شاداب صبح کا نقشہ پیش کر رہے ہیں جس کی رات میں بارش ہو چکی ہے۔ پانی برسنے سے برگِ نخیل گرد و غبار سے پاک ہو گئے ہیں اور نواح

مدینہ کی ریت پرنیاں کی طرح نرم ہوگئی ہے۔ رات کی بارش کے بعد جو سُرخ اور نیلی بدلیاں رہ گئی ہیں انھوں نے کوہ اضم کو رنگا رنگ لباس پہنا دیا ہے۔ ہر طرف نورانیت اور شادابی کا عالم ہے اسی بند میں اقبال نے ایک مشہور عربی قصیدے کی تشبیب کے ایک شعر کا مضمون بڑی خوبصورتی سے باندھا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

آگ بجھتی ہوئی ادھر ٹوٹی ہوئی طناب ادھر　　کیا خبر اس مقام سے گذرے ہیں کتنے کارواں

برگ نخیل اور کوہ اضم اور "ریگ نواح کاظمہ" کے ذکر سے اقبال نے پہلے ہی سرزمین عرب کی طرف قارئین کو متوجہ کر دیا تھا۔ اب بجھی ہوئی آگ اور ٹوٹی ہوئی طناب کا ذکر کر کے اپنے کلام کی خصوصیت اور اجاگر کر دی جسے حجازیت کہا جاتا ہے اس طرح قاری کا ذہن ارضِ حجاز کے اس مقدس اور پُرکشش ماحول میں پہونچ جاتا ہے جس سے خالص اسلامی تہذیب کی نمائندگی ہوتی ہے اور جو ہر مسلمان کے سینے میں ایمان کی شمع روشن کر دیتا ہے۔ عرب شاعر نے بجھی ہوئی آگ اور ٹوٹی ہوئی طناب کے ذکر سے یہ اشارہ کیا ہے کہ اس کے محبوب کا قافلہ اس مقام سے کوچ کر گیا۔ اقبال نے ان چیزوں کو استعارے کے طور پر استعمال کر کے ایک نئے معنی دے دیئے ہیں۔ انھوں نے اس طرح ان مقدس یادگاروں کی طرف اشارہ کیا ہے جو مدینہ طیبہ کے آس پاس موجود ہیں اور دورِ رسالت کے پاکیزہ ماحول کی یاد دلاتی ہیں۔ اس مقام پر جبرئیل کی آواز انھیں بتاتی ہے کہ ان کا محبوب مقام یہی ہے اور یہیں وہ عیش و آرام حاصل کر سکتے ہیں۔ اس طرح اقبال نے تمہیدی مضامین کے بعد اپنے اصل مدعا یعنی ثنائے رسولؐ کی طرف بڑی دل کشی کے ساتھ گریز کیا ہے جو ان کے اعلیٰ فنی شعور کی گواہی دیتا ہے۔

دوسرے بند میں اقبال نے دنیائے اسلام کی پستی اور زبوں حالی پر رنج و غم کا اظہار کیا ہے اور اس بات کا گلہ کیا ہے کہ کائنات کی اس پرانی بزم میں ان کی تازہ واردات کو سمجھنے والے بہت

کم ہیں۔ انھیں شکایت ہے کہ اہل اسلام میں اب محمود غزنوی جیسے بت شکن نہیں ملتے۔ عرب اور عجم دونوں اپنی سابقہ خصوصیات سے محروم ہیں۔ انھیں اپنے دور کے مسلمانوں میں وہ جذبۂ ایمانی اور جوش کردار نظر نہیں آتا جو اسلاف کا جوہر تھا۔ ان میں اب وہ عشق باقی نہیں جو زندگی کے ہر شعبے میں ان کی رہنمائی کرتا تھا شیطانی طاقتیں ہر طرف سر اٹھا رہی ہیں مگر کوئی ایسا نہیں جو شہید کربلا امام حسینؓ کی طرح سر بکف میدان میں آ کر ان کو شکست دے سکے۔

تیسرے بند میں اقبال نے رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مخاطب کر کے حضور کی مدح ثنا شروع کی ہے۔ آپ کو "آیۂ کائنات کا معنی دیریاب" اور مقصدِ عالمین بتایا ہے پھر علم و عرفان کے میدانوں میں کم ذوقی کا شکوہ کر کے اپنے اندازِ سخن کو آتشِ رفتہ کا سراغ اور کھوئے ہوؤں کا کی جستجو بتایا ہے اور اس بند کو اس دعا پر ختم کیا ہے ؎

فرصت کشمکش مدہ این دلِ بے قرار را یک دو شکن زیادہ کن گیسوئے تابدار را

چوتھے بند میں چھ شعر ہیں اور سب نعتیہ ہیں۔ اقبال کہتے ہیں کہ اے میرے آقا و مولا آپ ہی سب کچھ ہیں۔ آپ کا وجود الکتاب ہے۔ تمام کائنات آپ ہی کے طفیل میں پیدا ہوئی ہے۔ آپ ہی کے جمالِ مقدس سے ہر طرف روشنی پھیلی۔ سنجر وسلیم کی شوکت سے آپ کی شان جلال اور جنید و بایزید کے فقر سے آپ کی شان کا اظہار ہوتا ہے۔ آپ کی ذات ایسے کمالات کا مجموعہ ہے کہ عقل و عشق دونوں اپنے اختلاف کے باوجود آپ کی بدولت اپنے اپنے مقاصد سے ہمکنار ہیں۔ عقل غیاب و جستجو کو پسند کرتی ہے اور چونکہ وہ آپ کو سمجھنے سے قاصر ہے اس لئے وہ محو جستجو ہے۔ عشق حضوری کے باوجود اضطراب چاہتا ہے۔ اس لئے اگرچہ اس کو سرکار رسالتؐ میں حضوری حاصل ہے مگر بے چین اور مضطرب رہتا ہے اور یہی اس کا مقصد ہے۔ آخر میں دعا کرتے ہیں کہ آج دنیا مادیت کے اندھیروں میں بھٹکتی پھر رہی ہے آپ اپنی ایک جھلک دکھا کر روحانیت کی

روشنی سے اس کو سیدھے راستے پر لگا دیں۔

پانچویں بند میں اقبال نے اپنی گذشتہ زندگی کی علمی مصروفیات پر افسوس اور ندامت کا اظہار کیا ہے مسلم کو 'نخیل بے رطب' اور عقل کو 'تمام بولہب' قرار دے کر عشق کی صفات کو بڑے پرجوش انداز میں بیان کیا ہے اور علم و عقل پر اس کی برتری واضح کی ہے۔

'ذوق و شوق' کے آخری دو بند قدرتِ بیان اور حسنِ کلام کے اعلیٰ نمونے ہیں۔ آخری بند نقطۂ عروج کی شان رکھتا ہے۔ کیونکہ اس کی ٹیپ کے شعر تک پہونچ کر ایک ایسی تکمیل اور آسودگی کا احساس ہوتا ہے جو ایک عظیم فن پارے سے حاصل ہوتی ہے۔ فنی اعتبار سے "ذوق و شوق" ایک ممتاز ادبی تخلیق ہے۔ اپنی چند دیگر نظموں کی طرح اس میں بھی اقبال نے ترکیب بند ہئیت کو بڑی کامیابی سے استعمال کیا ہے۔ اس نظم کی بحر بھی بہت رواں، شگفتہ اور ترنم آفریں ہے اور شاعر کے جذبات و خیالات سے ہم آہنگی رکھتی ہے۔ اس نظم میں اقبال کی منظر کشی کا بھی اعلیٰ نمونہ ملتا ہے۔ وسیع مضامین کو ایک شعر میں خوبصورتی سے ادا کر دینا اقبال کا حصہ ہے۔ اس نظم میں ایسے بھی کئی شعر موجود ہیں مثلاً ؎

صدق خلیلؑ بھی ہے عشق، صبر حسینؓ بھی ہے عشق!
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق!
تازہ مرے ضمیر میں معرکۂ کہن ہوا!
عشق تمام مصطفیٰؐ، عقل تمام بولہب!
گرمیٔ آرزو فراق، شورش ہائے و ہو فراق
موج کی جستجو فراق، قطرہ کی آبرو فراق

اقبال کی شاعری امید و حیات کا پیغام ہے وہ مایوس یا افسردہ نہیں بناتی۔ چنانچہ

یہ نظم بھی دلوں میں ولولہ پیدا کرتی ہے۔ اس لئے ایمان کو جلاء اور عزم کو پختگی ملتی ہے۔

حسین اور معنی خیز استعارے، دلکش تشبیہیں، شاندار فارسی الفاظ اور تراکیب جگہ جگہ جلال و جمال کا حسین امتزاج اس نظم کی دلکشی میں اضافہ کرتے ہیں۔ یہ نظم موضوع کی پاکیزگی اور اسلوب کی رعنائی کا ایک دل کش مرقع ہے۔ اقبال کے جمالیاتی ذوق اور ان کے نکھرے ہوئے فنی شعور نے اس نظم میں جو حسن کاری اور مرصع سازی کی ہے وہ ایک خاص ادبی مقام رکھتی ہے۔ فکر و فن کی بلندی نے "ذوق و شوق" کو ایک زندہ جاوید ادبی تخلیق کا مرتبہ دے دیا ہے۔ اس کے مطالعہ سے ہر مرتبہ ایک نیا کیف حاصل ہوتا ہے۔

حسن جعفری

ساقی نامہ

ساقی نامہ اقبال کے بال جبرئیل کا شاہکار ہے۔ بال جبرئیل میں اس کی وہی حیثیت ہے جو جسم میں روح کی، ساقی نامہ ہماری شاعری میں فارسی شاعری ہی سے آیا ہے۔ اس کی حیثیت ایک صنف کی سی ہے۔ اس صنف یا عنوان کے تحت عموماً ہماری شاعری میں مے و میخانہ، موج و مینا اور رندی و مستی کی محفلیں آراستہ کی گئی ہیں یا حسن و شباب اور رنگ و بو کی داستانوں سے صفحے کے صفحے رنگے گئے ہیں۔ بعض قدیم ساقی ناموں میں شراب یا حسن و عشق کے پردہ میں تصوف کے مسائل کی ترجمانی بھی کی گئی ہے۔

اس صنف میں ساقی سے تخاطب کے دو وجوہ سمجھ میں آتے ہیں۔ اول یہ کہ فارسی اور اردو شاعری دونوں کا یہ روایتی انداز ہو گیا ہے کہ بار بار ساقی کو پکارا جاتا ہے۔ دوسرے اس میں یہ رعایت مدنظر ہے کہ شراب جذبات و کیفیات میں شدت پیدا کر دیتی ہے اور شاعر چاہتا ہے کہ اپنے جذبات کو چاہے وہ شراب کے متعلق ہوں یا حسن و شباب یا الٰہیات سے وابستہ ہوں انتہائی جوش سے پیش کرے اور اس غرض سے وہ اول شراب کا خواہاں ہوتا ہے۔

اقبال کے ساقی نامہ میں میخانہ بھی، پیمانہ بھی، مینا و قلقلِ مینا بھی ہے۔ اور ان سب کی روح بھی

یعنی شراب لیکن اس کی شراب شرابِ خودی ہے جو جسم بے جان میں جان ڈالتی ہے۔ انسان کی سوئی ہوئی قوتوں کو ابھارتی ہے دِل کی ڈوبتی ہوئی نبضوں کو پھر سے متحرک کر دیتی ہے اور دماغوں سے وہ پردہ ہٹا دیتی ہے جس نے اس سے سوچنے سمجھنے کی قوت چھین لی ہے۔

اقبال کے کلام کو عموماً تین ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ فطرت نگاری، وطنیت اور اسلامیات ساقی نامہ اقبال کے آخری دَور (اسلامیات) کی یادگار ہے۔ لیکن اس میں ان کے ابتدائی دور (فطرت نگاری) کو بھی ہم واضح دیکھتے ہیں۔ ساقی نامہ کی ابتدا ہی فطرت نگاری سے ہوتی ہے ؎

ہوا خیمہ زن کاروان بہار — ارم بن گیا دامن کوہسار
گل و نرگس و سوسن و نسترن — شہید ازل لالہ خونین کفن
فضا نیلی نیلی ہوا میں سرور — ٹھہرتے نہیں آشیاں میں طیور
وہ جوئے کہستاں اچکتی ہوئی — اٹکتی لچکتی سرکتی ہوئی

یہ اشعار منظر نگاری کا بہترین نمونہ ہیں۔ ان کے پس پردہ اقبال کی روحانی قوت کام کر رہی ہے۔ دوسرے شعرا کی منظر نگاری اور اقبال کی منظر نگاری میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اقبال نیلی نیلی پرسرور فضا میں طیور کو اُڑتا ہوا دیکھ کر عارضی خوشی نہیں حاصل کرتا، جوئے کہستاں کو ناگن کی طرح لہراتے دیکھ کر اُس کے دل و دماغ میں کسی محبوبہ کی کاکل پیچاں کا تصور نہیں آیا بلکہ اس کی روانی سے زندگی کو حرکت کا مرادف سمجھا ؎

ذرا دیکھ اے ساقی لالہ فام — سُناتی ہے یہ زندگی کا پیام

اس فطرت نگاری اور رنگ و بو کے پردے سے اقبال کے پیام کا سرچشمہ شروع ہوتا ہے۔ زندگی کی طرف اُس کی توجہ منتقل ہو جاتی ہے۔ اور اب وہ زندگی اور اس کے مسائل کو فلسفہ اور شعر کے امتزاج کے ساتھ پیش کرنا چاہتا ہے۔

فلسفہ ایک خشک چیز ہے جس سے عام دماغ الجھن محسوس کرتے ہیں اور حقیقت بھی یہ ہے کہ فلسفہ کا آغاز ہی الجھن، سوچ بچار یا حیرت سے ہوتا ہے۔ شعر کے ساتھ اس کی ہم آہنگی اجتماع ضدّین سے کم نہیں لیکن اقبال نے ان دونوں کو اس طرح شیر و شکر کیا ہے کہ یہ محال ممکن ہو کر آنکھوں کے سامنے آگیا ہے۔

فلسفہ اور شعر کے متعلق ڈاکٹر عابد لکھتے ہیں: "فلسفہ حقیقت کی خشک اور بے جان تعبیر ہے اور شعر اس کی زندگی سے جھلکتی ہوئی تفسیر۔ فلسفی صورتِ کائنات کا ذہنی ادراک کرتا ہے اور اپنے ادراکات کو مجرد تصورات میں بیان کرتا ہے جو ہماری لوحِ فکر پہ درج ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اور شاعر نبضِ کائنات کی تڑپ، قلبِ حیات کی دھڑکن کو محسوس کرتا ہے اور اپنے احساسات کو متحرک نقش اور نغمے میں ادا کرتا ہے جو ہمارے دِل میں اُتر کر خون کے ساتھ گردش کرنے لگتے ہیں۔" اقبال کی شاعری کو فلسفیانہ شاعری کہنے کے یہ معنی نہیں کہ اس میں صرف حکمت کے ٹھوس اور خشک نظریات کے سوا کچھ نہیں۔ اس کی شاعری میں زندگی کا سوز و ساز بھی ہے اور حرکت و عمل کا درس بھی۔

عابد صاحب فرماتے ہیں "جب شعر کے لئے فلسفہ کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے تو فلسفہ کی صرف ایک صفت مدِ نظر ہوتی ہے یعنی موضوع کی کلیت اور ہمہ گیری۔ اقبال کا کلام فلسفیانہ اسی معنی میں ہے کہ وہ ایک کلّی تصورِ حیات پیش کرتے ہیں۔ ان کا موضوع فرقہ اور ملت کی زندگی کا ایک جامع نصب العین ہے جسے ہم فلسفہ تمدن کہہ سکتے ہیں۔ اقبال کے کلام میں فلسفہ اور شعر کا تعلق یہی ہے۔"

فلسفیانہ تصورِ حیات کے ساتھ ساتھ اس کے طرزِ بیان میں وہی رنگینی، چاشنی، تڑپ اور سوز و گداز موجود ہے جو دوسرے شعرا کے یہاں پایا جاتا ہے اور جن کا گہرا تعلق رومانی دنیا سے ہے۔ چنانچہ ساقی کو دیکھ کر ان کے دل میں بھی اُمنگ اُٹھتی ہے۔ اگرچہ ان کی شراب اور ہے لیکن طرزِ تخاطب میں وہی رومانیت اور رنگینی ہے ؎

پلا دے مجھے وہ مئے پردہ سوز　　کہ آتی نہیں فصلِ گُل روز روز

اب اس مے کی تعریف بھی اقبال ہی کی زبان سے سُن لیجیے ؎

وہ مئے جس سے روشن ضمیر حیات　　وہ مئے جس سے ہے مستی کائنات

وہ مے جس میں ہے سوز و ساز ازل　　وہ مے جس سے کھلتا ہے راز ازل

اٹھا ساقیا پردہ اس راز سے　　لڑا دے ممولے کو شہباز سے

آخری مصرع میں حرکت اور قوت جس کو اقبال زندگی کا اساس سمجھتا ہے اس کی تلقین کتنے لطیف پیرایہ میں کی ہے۔ ان مراحل کے بعد وہ اصل موضوع پر آیا ہے اور اپنا نظریہ حیات اور فلسفہ خودی پیش کیا ہے

فطرت نگاری کے اس پس منظر کے بعد اصل موضوع کی تمہید کے لئے تغیرات زمانہ کی طرف اشارات کئے ہیں ؎

زمانے کے انداز بدلے گئے　　نیا راگ ہے ساز بدلے گئے

ہوا اس طرح فاش راز فرنگ　　کہ حیرت میں ہے شیشہ باز فرنگ

پرانی سیاست گری خوار ہے　　زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے

گیا دَور سرمایہ داری گیا　　تماشہ دکھا کر مداری گیا

زندگی کے مسائل سے بحث کرنے کے لئے یہ تمہید نہایت موزوں اور ضروری تھی۔ انقلاب زمانہ کی اس سے بہتر تصویر ایسے سادہ الفاظ میں کھینچ دینا اقبال کا کمال فن ہے اور اس تصویر میں رفتار زمانہ کا خائر مطالعہ جھلکتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس نظم کے مطالعہ سے اقبال کے حیات اور خودی کے تصورات اور اخلاقی و معاشرتی اصولوں کی تعلیم کو پوری طور سے سمجھا جا سکتا ہے۔ اس آئینہ میں عشق، زندگی اور خودی سبھی کچھ موجود ہے۔

اس کے بعد اقبال کی نظر مسلمانوں کی گمراہی کی طرف گئی اور اس نے ان توضیحات کو غلط بتایا ہے جو ایرانی فلاسفہ اور ہندوستانی صوفیہ نے مسئلہ وحدت الوجود کے تعلق میں کی ہیں اور جن کے ذریعہ ایسی روایات اور اعتقادات اسلام کا جز بن گئے ہیں جو قطعاً غیر اسلامی ہیں۔ دولت عباسیہ میں اسلامی تعلیم و تصوف میں فلسفہ کا امتزاج صحیح معنوں میں ابن عربی کے ہاتھوں ہوا۔ یہ عنصر تھوڑے ہی عرصہ میں تقویت پا گیا۔ چنانچہ ملا جامی کی لوائح اچھی خاصی فلسفیانہ تصنیف معلوم ہوتی ہے۔ ہندو مذہب کے آتما کے فلسفہ اور بدھ مت کے نروان کے مسئلہ نے بھی اپنا اثر ڈالا۔ عیسائی مذہب کے اثر سے راہبانہ زندگی اور خانقاہ کا تصور اسلام میں داخل ہوا۔ قلندر اور سدا سہاگن راہبوں کی زندگی کا نمونہ ہیں انھیں غیر اسلامی اجزا کی طرف اقبال نے اشارہ کیا ہے ؎

تمدن تصوف شریعت کلام — بتانِ عجم کے پجاری تمام
حقیقت خرافات میں کھو گئی — یہ امت روایات میں کھو گئی
وہ صوفی کہ تھا خدمتِ حق میں مرد — محبت میں یکتا حمیت میں فرد
عجم کے خیالات میں کھو گیا — یہ سالک مقامات میں کھو گیا

اقبال کے اس تمام فلسفیانہ پیام پر اسلامیات کا گہرا رنگ ہے۔ اسے مغربیت سے انتہائی نفرت ہے اسے یہ موجودہ تہذیب و تمدن نہیں بھاتا۔ وہ اسی اسلامی معاشرت اور اسی جذبہ اسلامی کو پھر دیکھنا چاہتا ہے چنانچہ ؎ نئی تہذیب تکلف کے سوا کچھ بھی نہیں ہے صاف ظاہر ہے کہ وہ اس تہذیب کو کس نگاہ سے دیکھتا ہے ؎

شراب کہن پھر پلا ساقیا — وہی جام گردش میں لا ساقیا

وہ اس اسلامی روح کو تلاش کرتا ہے جس نے خیبر شکن ایسی ہستیاں اور صدیق ایسے

برگزیدہ بندے اور فاروق ایسے جری اور بہادر انسان پیدا کئے۔

قبل اس کے کہ فلسفہ حیات و خودی پر بحث کی جائے اقبال کے پیام کی وسعت پر ایک نظر ضروری ہے۔ بہت سے لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ اقبال کے پیش نظر کل بنی نوع انسان نہیں بلکہ صرف مسلمان ہیں اور ان کا خطاب صرف مسلمانوں سے ہے۔ ان کی زندگی کے نظریات اور تہذیب و تمدن کے بنیادی اصولوں سے صرف مسلم افراد ہی مستفید ہو سکتے ہیں اور وہ جس زندگی کا نصب العین پیش کرتے ہیں وہ صرف ایک ہی ملت اور فرقہ کے لئے ہے اور یہ ان لوگوں کے نزدیک اقبال کی تنگ نظری، اور بہت بڑی نفسیاتی کمزوری ہے۔ اقبال نے اسلامی فلسفۂ زندگی اور اس کے نادر و نایاب اخلاقی و معاشرتی اصولوں کو آئیڈیل (IDEAL) قرار دیا ہے۔ اسلام خود تمام بنی نوع انسان کے لئے آیا تھا نہ کہ کسی خاص فرقہ یا کسی خاص گروہ کے لئے۔ اس لئے اس کا فلسفہ زندگی بھی ہر اس زندہ ہستی کے لئے تھا جو اپنے کو انسان کہے۔ سر تیج بہادر سپرو مولانا عبدالحق کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"اقبال کے ساتھ میرے خیال میں وہ لوگ بڑی بے انصافی کرتے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ وہ محض اسلامی شاعر ہے۔ یہ کہنا اس کے دائرہ اثر کو محدود کرنا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس نے اسلامی فلسفہ، اسلامی عظمت اور اسلامی تہذیب پر بہت کچھ لکھا ہے لیکن کسی نے آج تک ملٹن کی نسبت یہ کہہ کر کہ وہ عیسائی مذہب کا شاعر تھا یا کالیداس کی نسبت یہ کہہ کر کہ وہ ہندو مذہب کا شاعر تھا اس کے اثر کو نہ محدود کیا اور نہ دوسرے مذہب کے آدمیوں نے اس کی قدر میں کمی کی۔ اگر وہ اسلامی تاریخ کے بڑے بڑے کارناموں کے بارے میں یا اسلامی عظمت کا تذکرہ کرتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ غیر مسلم اس کی قدر دانی نہ کریں۔" اس بنا پر اقبال کے پیغام کو محدود نہیں کہا جا سکتا۔ وہ فی الحقیقت اپنے پیش کردہ تصور حیات و خودی کو جو

بلاشبہ اسلامی تعلیم کا بڑی حد تک مرہون منت ہے صحیح محسوس کرتا ہے۔ کل عالم کو اس طرف چلنے کی دعوت دیتا ہے۔ کوئی بھی پیغام ہو لیکن وہ کسی نہ کسی مخصوص مسلک پر ضرور اپنی بنیاد رکھتا ہے۔ دنیا کا کوئی شاعر یا آرٹسٹ ایسا نہیں گزرا جس نے اپنا پیغام کسی خاص پلیٹ فارم سے نہ دیا ہو۔ اس قسم کے اعتراضات سے شاعر یا آرٹسٹ کے خلوص کو مجروح کرنا خود معترضین کی تنگ نظری اور نفسیاتی کمزوری کہی جا سکتی ہے۔

اب ان کے ان نظریات پر روشنی ڈالنی چاہیئے جن کو اقبال نے اپنی نظم میں شعریت کے لباس میں پیش کیا ہے۔ سب سے پہلے اس نے عشق کو سمجھایا ہے، پھر زندگی اور ارتقا سے بحث کی ہے۔ پھر خودی کی پنہاں قوتوں کو بیان کیا ہے۔ اس جگہ ہمیں یہ بات دھیان میں رکھنی چاہیئے کہ اقبال کے تمام فلسفہ پر اگر ایک طرف اسلامی مفکرین بالخصوص جلال الدین رومی کا اثر ہے تو دوسری طرف مغربی مفکرین خصوصاً نطشے کا اثر نمایاں ہے۔

اقبال کی شاعری میں عشق و عقل کا تقابل ہر جگہ موجود ہے۔ وہ عشق کو عقل پر ترجیح دیتا ہے اس بارے میں وہ رومی اور نطشے دونوں کا ہم خیال ہے۔ دونوں جذباتی اور جمالیاتی کیفیات کو استدلال پر فوقیت دیتے ہیں جس طرح رومی اور نطشے موسیقی کو استدلال پر ترجیح دیتے ہیں اسی طرح اقبال شعر کو خشک فلسفہ پر۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنے فلسفہ کی بنیاد بڑی حد تک عشق پر رکھی ہے ؎

مجھے عشق کے پر لگا کر اڑا — مری خاک جگنو بنا کر اڑا
جگر سے وہی تیر پھر پار کر — تمنا کو سینوں میں بیدار کر

یہاں یہ فرق یاد رکھنا چاہیئے کہ اقبال نطشے کی طرح جذباتی کیفیات کو صرف عالم امکان تک محدود نہیں رکھتا۔ وہ خدا کا بھی قائل ہے اور اس کا جذبہ عشق عالم امکان کے

ساتھ ساتھ اسے خدا سے بھی وابستہ کرتا ہے لیکن یہاں رومی کی طرح وہ ذات میں محو ہو کر نہیں رہ جاتا بلکہ وہ عشق کے پہلو کو ارتقائے انسانی کا پہلو سمجھتا ہے۔ وہ اس عشق کے جذبہ کو نوجوانوں میں محکم دیکھنا چاہتا ہے ؎

جوانوں کو سوز جگر بخش دے　　مرا عشق میری نظر بخش دے

زندگی کو اقبال حرکت، عمل اور جدوجہد سے تعبیر کرتا ہے۔ وہ اس کو فانی اور لازوال پذیر نہیں سمجھتا بلکہ اسے ابدیت سے معمور پاتا ہے ؎

دمادم رواں ہے یم زندگی　　ہر اک شے سے پیدا ارم زندگی
ٹھہرتا نہیں کاروان وجود　　ہر لحظہ ہے تازہ شان وجود
سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی　　فقط ذوق پرواز ہے زندگی

انسان کی انفرادی زندگی مٹ جانے والی ہے لیکن زندگی بالذات ختم ہونے والی نہیں۔ ارتقائے حیات کی کوئی منزل مقرر نہیں کی جا سکتی۔ اقبال نطشے اور رومی تینوں، اس کے قائل ہیں لیکن نطشے نے اپنے حیات اور ارتقائے حیات کی بنیاد ڈارون کے نظریہ پر رکھی ہے اس کے نزدیک آنے والا انسان موجودہ انسان سے اتنا ہی مختلف ہے جتنا موجودہ انسان کیڑے مکوڑے سے ہے۔ اس کا یہ نظریہ انسانی نصب العین کے لئے بہت حوصلہ افزا ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ دوسری طرف زندگی کی تکرار کا نظریہ بھی رکھتا ہے یعنی زندگی اپنے کو دہراتی ہے، جس حالت سے زندگی گذر چکی ہے اس حالت سے پھر گذرے گی۔ انسان جس منزل سے گذر چکا ہے اسے اس منزل سے پھر گزرنا ہے۔ ارتقا اور تکرار کا یہ تناقض نطشے کے نظریہ کو مہمل بنا دیتا ہے۔

جہاں تک ارتقا کا تعلق ہے رومی اور اقبال نطشے کے ساتھ ہیں اور تکرار حیات

میں نطشے کے مخالف۔

اقبال کہتا ہے ؎

پسند اس کو تکرار کی خو نہیں ۔ کہ تو میں نہیں اور میں تو نہیں

رومی کہتا ہے ؎

مردم از حیوانی و آدم شدم ۔ پس چہ ترسم من ز مردن کم شدم

ارتقا کے مسئلے میں بھی رومی اور اقبال نطشے سے اس حد تک مخالف ہیں کہ نطشے میں برگساں کی دہریت موجود ہے۔ اقبال نے برگساں کی دہریت اور اسلام کی توحید کو ملا کر ارتقا کا فلسفہ پیش کیا ہے۔ برگساں ارتقائے حیات کا قائل ہے لیکن وہ اس ارتقا کی علت کسی پس پشت قوت کو نہیں سمجھتا بلکہ خود آپ کو بالذّات آمادۂ ارتقا سمجھتا ہے۔ اقبال جہاں تک حیات کو مائل ارتقا سمجھنے کا سوال ہے برگساں کے ساتھ ہے لیکن اس ارتقا میں ایک پنہاں قوت کا ہاتھ تسلیم کرتا ہے۔ یہی پنہاں قوت اس کے نزدیک ذات باری تعالیٰ ہے۔

اقبال نے خودی کے وہ معنی نہیں لیے ہیں جو عام طور سے رائج ہیں وہ "اسرار خودی" کے دیباچہ میں لکھتا ہے کہ "یہ لفظ بمعنی زور نہیں استعمال کیا گیا ہے جیسا کہ عام طور پر اردو میں مستعمل ہے۔ بلکہ اس کا مفہوم محض احساس نفس یا یقین ذات ہے"۔ چنانچہ اس بنا پر اقبال نے خودی کے مختلف خوبصورت محل تعمیر کئے ہیں ؎

خودی کیا ہے راز درون حیات ۔ خودی کیا ہے بیداری کائنات

ازل سے یہ ہے کشمکش میں اسیر ۔ ہوئی خاک آدم میں صورت پذیر

خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے ۔ فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے

اقبال کے نزدیک خودی کا استحکام یہ ہے کہ انسان اپنے طبعی ماحول سے جنگ کرتا ہے عابد صاحب کے

الفاظ میں اسے یوں سمجھئے "وہ ہمیشہ اپنے لئے نئے نئے مقاصد متعین کرتا ہے اور انھیں حاصل کرنے کی سعی میں سرگرم رہتا ہے: اس میں اسے اپنے ماحول میں تصرف کرنا اپنی راہ سے رکاوٹ کو دور کرنا اور مشکلات کا مقابلہ کر کے ان پر غالب آنا پڑتا ہے۔ اس طرح سے اس کی ذہنی اور عملی قوتیں برابر ہوتی جاتی ہیں اور اس کے سینہ میں خودی کی آگ مشتعل ہوتی جاتی ہے۔"

اقبال نے خودی کے تین مدارج بتائے ہیں:۔

"مرحلۂ اول را اطاعت، مرحلۂ دوم را ضبط نفس، مرحلۂ سوئم را نیابت الٰہی نامند" خودی اس کے نزدیک حدِ اطاعت اور ضبط نفس کے مراحل طے کر کے نیابت الٰہی کے درجہ پر پہونچ جاتی ہے تو انسان مسخّر کائنات ہو جاتا ہے لیکن اس زمان و مکان کی تسخیر ہی خودی، کی آخری منزل نہیں بلکہ وہ اس کو پہلی منزل سمجھتے ہیں ؎

خودی کی یہ ہے منزل اولیں — مسافر! یہ تیرا نشیمن نہیں
بڑھے جا یہ کوہ گراں توڑ کر — طلسم زمان و مکاں توڑ کر
جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود — کہ خالی نہیں ہے ضمیر وجود

اقبال کی خودی کا فلسفہ ان کے تمام فلسفہ پر دائرہ کھینچے ہوئے ہے۔ اس تصور میں بھی وہ رومی اور نطشے سے متاثر نہیں تسخیر کائنات اور علوے آدم کے تینوں قائل ہیں لیکن فرق یاد رکھنا چاہیئے۔ وہ یہ ہے کہ نطشے کے یہاں جلال کا پہلو غالب ہے اور رومی کے یہاں جمال کا۔ اقبال نے جلال اور جمال دونوں میں توازن پیدا کر دیا ہے۔

علوئے آدم کا تصور جو خودی کے سلسلہ میں ہے تینوں میں پایا جاتا ہے۔ اس میں آپس میں ذرا سا فرق ہے اور وہ یہ کہ نطشے خدا کا قائل نہ تھا اور مذہب کو دشمن خودی تصور

کرتا ہے اس کی نظر صرف فطرت اور انسانی محکمات تک ہے۔ برخلاف اس کے رومی اور اقبال دونوں کے یہاں خدا بھی موجود ہے۔ اس سلسلہ میں یہ جملہ بہت مشہور ہے اور فی الواقع صحیح بھی۔ رومی کامرد عارف، نطشے کے فوق البشر سے مل کر اقبالی انسان بن گیا ہے۔

اقبال اور رومی نے جہاں خودی کا تعلق خدا کے ساتھ بتایا ہے وہاں ان کے تصورات میں تھوڑا سا فرق ہو جاتا ہے۔ رومی کے نزدیک خودی جب خدا سے ملتی ہے تو انفرادیت انسانی قائم نہیں رہتی اور اس کی مثال ایسی ہے جیسے قطرہ دریا میں مل جائے۔ اقبال وصل کا قائل نہیں۔ ان کے یہاں جو وصل ہے وہ ایک خاص حالت ہے جس میں اضطراب اور بے چینی اور دوئی ہو جاتی ہے۔ خدا سے مل کر بھی اس کے نزدیک احساس خودی قائم رہتا ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ جیسے سورج کی روشنی میں چراغ۔ ساقی نامہ مجموعی حیثیت سے اقبال کی بہت مکمل نظم ہے۔

شعر اور فلسفہ کا امتزاج جیسا اس نظم میں ہے سوائے بانگ درا کی "شمع و شاعر" کے اقبال کے بقیہ اردو کلام میں کہیں نہیں پایا جاتا۔

کلیم الدین احمد

شعاعِ اُمید

میں نے سب سے پہلے لوگوں کو اس نظم کی خوبیوں کی طرف توجہ دلائی تھی. اُردو شاعری پر ایک نظر میں لکھا تھا:

"یہاں بھی خیالات ہیں، مشرق و مغرب پر نظر ہے، نوید امید کا بیان ہے لیکن ان سب چیزوں کو شاعری کے سانچے میں ڈھالا گیا ہے. خیالات عمیق و بلند اور وسیع نہیں. شاید اسی وجہ سے یہ بہ آسانی شاعرانہ خیالات میں تبدیل ہو گئے ہیں یعنی یہاں ایک تخیلی تجربہ ہے اور یہی اس نظم کی کامیابی کی وجہ ہے.

شعاعیں ایک مدت سے پنہائے فضا میں آوارہ و پریشاں رہتی ہیں. آخر بے مہری ایام سے متاثر ہو کر سورج انھیں پیغام دیتا ہے:

پھر میرے تجلی کدہ دل میں سما جاؤ　　چھوڑ دو چمنستاں و بیابان و در و بام

آفاق کے ہر گوشہ سے شعاعیں اٹھتی ہیں کہ خورشید سے ہم آغوش ہو جائیں. مشینوں کے دھوئیں سے مغرب کی سیہ پوشی اور مشرق کی خاموشی پر کمنیں اشارہ کرتی ہوئی مہر جہاں تاب سے ہم آغوشی کی خواہاں ہوتی ہیں لیکن ایک شوخ کرن، شوخ مثالِ نگہ حور، فرصت تنویر کی التجا کرتی ہے

یہ شعاع امید ہے۔ ہندوستان کی موجودہ گراں خوابی، اس کی گذشتہ بیداری کا ذکر کرتے ہوئے وہ اپنا عزم ظاہر کرتی ہے۔

چھوڑوں گی نہ میں ہند کی تاریک فضا کو　　جب تک نہ اُٹھیں خواب سے مردانِ گراں خواب

کیسی حسین و پاکیزہ نظم ہے! یہاں ارتقائے خیال ہے، اشعار میں ربط و تسلسل ہے، خیالات میں ابتدا، عروج اور پھر انتہا بھی ہے۔ یہ صحیح معنوں میں نظم ہے۔ غزل نے نظم کا بھیس نہیں بدلا ہے۔ خیالات میں بلندی اور گہرائی نہ سہی، جذبات میں ظاہری جوش و خروش اور لفظوں اور بندشوں میں شان و شوکت نہ سہی لیکن یہاں خیالات میں تخیل کا رنگ ہے۔ طرز ادا سادہ اور پاکیزہ ہے۔ اس نظم سے خیالات برانگیختہ نہ ہوں لیکن بار بار پڑھنے سے اس کی دلکشی میں کمی نہیں، اضافہ ہوتا ہے۔ کاش اقبال اس قسم کی نظمیں اور لکھتے"

پہلے دو بندوں کو لیجئے۔ اقبال جو کہنا چاہتے ہیں اسے وہ بلا واسطہ نہیں کہتے بلکہ بالواسطہ کہتے ہیں۔ ایک طویل استعارہ کی مدد سے کہتے ہیں۔ اقبال کی شخصیت سامنے نہیں آتی۔ وہ پس پردہ رہتی ہے۔ سامنے سورج اور اس کی شعاعیں ہیں۔ سورج جس نے نہ جانے کب سے دنیا کا نظارہ کیا ہے کیسے کیسے واقعات دیکھے ہیں بقول آتش ؎

زمینِ چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا　　بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

آخر سورج، دنیا اور اس کے مستقبل سے نا امید ہو جاتا ہے اسی لئے وہ کہتا ہے:

سورج نے دیا اپنی شعاعوں کو یہ پیغام　　دنیا ہے عجب چیز کبھی صبح کبھی شام
مدت سے تم آوارہ ہو پہنائے فضا میں　　بڑھتی ہی چلی جاتی ہے بے مہریٔ ایام
نے ریت کے ذروں پہ چمکنے میں ہے راحت　　نے مثلِ صبا طوفِ گل و لالہ میں آرام
پھر میرے تجلی کدۂ دل میں سما جاؤ　　چھوڑو چمنستان و بیابان و در و بام

حالانکہ سورج کا یہ کہنا کہ دنیا ہے عجب چیز کبھی صبح کبھی شام، کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے کیونکہ صبح و شام، روز و شب کا سبب زمین کی گردش ہے، بہر کیف اس کی شعاعیں مدت سے پہنائے فضا میں آوارہ ہیں لیکن نتیجہ کچھ بھی نہیں بلکہ اُلٹا ہے، بڑھتی ہی چلی جاتی ہے بے مہری ایام، ان شعاعوں کو نہ تو ریت کے ذرّوں پر چمکنے میں کوئی راحت ہے اور نہ طوف گل و لالہ میں کوئی آرام ہے۔ اسی لئے سورج زمین کو اپنی شعاعوں کی روشنی کا اہل نہیں سمجھتا اور کہتا ہے ؎

پھر میرے تجلّی کدۂ دل میں سما جاؤ

چھوڑو چمنستان و بیابان و در و بام

اور کرنیں اس حکم سے خوش ہوتی ہیں کیونکہ ان کی سعی کا نتیجہ کچھ بھی نہ تھا اور وہ آفاق سے ہر گوشے سے اُٹھ کر بچھڑے ہوئے خورشید سے ہم آغوش ہوتی ہیں اور دنیا میں جو کچھ انھوں نے دیکھا ہے اسے بیان بھی کرتی ہیں مغرب میں اُجالا ممکن نہیں کیونکہ اس کی مشینوں کے دھوئیں نے اسے سیہ پوش بنا دیا ہے۔ اقبال دوسری نظموں میں بھی مشینوں کا گلہ کرتے ہیں اور مشرق دھوئیں سے سیہ پوش تو نہیں اور لذت نظارہ سے محروم بھی نہیں لیکن اس پر ایک جمود سا طاری ہے اور عالم لاہوت کی طرح خاموش بیٹھا ہے۔ البتہ ایک شوخ کرن۔ شوخ مثال نگہ حور۔ کرن تو آپ نے دیکھی ہے لیکن نگہ حور نہیں دیکھی ہے۔ جو جوہر سیماب کی طرح آرام سے فارغ، ہے وہ سورج کے سینۂ روشن میں نہیں چھپتی بلکہ رخصت تنویر کی اجازت چاہتی ہے۔

جب تک نہ ہو مشرق کا ہر اک ذرّہ جہاں تاب

یہ شعاع امید ہے، یہ اقبال کی شاعری کی علامت ہے جو مغرب کی سیہ پوشی اور مشرق کے جمود دونوں کو بیک وقت رفع کرنا چاہتی ہے اسے معلوم ہے کہ:

جس ساز کے نغموں سے حرارت تھی دلوں میں
محفل کا وہی ساز ہے بیگانۂ مضراب
بُت خانے کے دروازے پہ سوتا ہے برہمن
تقدیر کو رُوتا ہے مسلماں تہِ محراب

لیکن یہ شعاعِ اُمید نہ تو مشرق سے بیزار ہے اور نہ مغرب سے حذر کرنا چاہتی ہے کیوں کہ:

فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

یہ طریقۂ شاعری ہے۔ اس میں پیغمبری بھی ممکن ہے لیکن یہ 'خضرِ راہ' یا 'طلوعِ اسلام' کے نثری خطیبانہ انداز سے بہت دور ہے۔ آپ سب کچھ کہہ سکتے ہیں۔ شاعری میں پیغمبری بھی کر سکتے ہیں لیکن سلیقہ شرط ہے ہر اک امر میں۔

فتح محمد ملک

ابلیس کی مجلس شوریٰ

ابلیس کی مجلسِ شوریٰ اقبال کی آخری عظیم نظموں میں سے ایک ہے۔ صورت و معنی ہر دو اعتبار سے یہ نظم اقبال کی آخری حدوں کو چھو رہی ہے۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے خیال میں شاعرانہ عظمت کا آخری مرحلہ وہاں سے شروع ہوتا ہے جہاں شاعر اپنے مافی الضمیر کو براہ راست ادا کرنے کی بجائے اپنے تخلیق کردہ کرداروں کی وساطت سے بیان کرتا ہے۔ اقبال برسوں پہلے حضرِ راہ لکھ کر فنی عظمت کے اس مرحلہ کو طے کر چکے تھے۔ زیرِ نظر نظم میں بھی اقبال نے ایک ڈرامائی صورتِ حال اور چند کرداروں کی تخلیق اور پیش کش سے عالمی سیاست پر گہرا، بلیغ اور مؤثر طنز بھی کیا ہے اور ایک حیرت انگیز پیش بینی کے ساتھ انسانیت کو آئندہ خطرات سے بھی آگاہ کیا ہے۔ مزید برآں اس نظم میں اقبال کے تصورِ ابلیس کا ایک نہایت اہم پہلو بھی جلوہ گیر ہے۔

مغرب کے دانش وروں نے بھی اس حقیقت کا اعتراف کر لیا ہے کہ اقبال کا تصورِ ابلیس عالمی ادب میں خوبصورت اور معنی خیز اضافہ ہے۔ اقبال سے پہلے دنیا کے ادب میں شیطان کی شخصیت بڑی حد تک جنسی جوش و خروش سے مستعار تھی۔ اقبال دنیا کے پہلے شاعر اور فلسفی ہیں جنھوں نے شیطان کی سیاسی شخصیت کو بے نقاب کیا ہے یا یوں کہئے کہ عالمی اور خصوصاً

مغربی سیاست کے شیطانی پہلوؤں پر جمالِ فن اور کمال دانش کے تمام تقاضوں کے ساتھ کاری ضرب لگائی ہے۔

اس نظم کی تخلیق سے پہلے بھی کلامِ اقبال میں کئی ایسے منتشر اشعار، قطعات یا مختصر نظمیں موجود تھیں جن میں شیطان کے سیاسی کردار پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ مثلاً اس وقت مجھے وہ اشعار یاد آرہے ہیں جن میں شیطان خدا سے استدعا کرتا ہے ؎

جمہور کے ابلیس ہیں اربابِ سیاست — باقی نہیں اب میری ضرورت تہ افلاک

یا ضربِ کلیم کے یہ اشعار ؎

تری حریف ہے یارب سیاستِ افرنگ — مگر ہیں اس کے پجاری فقط امیر و رئیس
بنایا ایک ہی ابلیس آگ سے تو نے — بنائے خاک سے اس نے دو صد ہزار ابلیس

ضربِ کلیم ہی کی ایک اور نظم "ابلیس کا فرمان اپنے سیاسی فرزندوں کے نام" میں شیطان یہ دلچسپ ہدایت جاری کرتا ہے ؎

اقبال کی غزل سے ہے لالے کی آگ تیز — ایسے غزل سرا کو چمن سے نکال دو

یہ ہماری خوش بختی ہے کہ ابلیس کے سیاسی فرزند اقبال کو چمن سے نکالنے میں ناکام رہتے ہیں اور بالآخر اقبال سیاست کے شیطانی پہلوؤں پر زیرِ نظر طویل ڈرامائی نظم لکھنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اب جبکہ یہ نظم نہ صرف وجود میں آچکی ہے بلکہ دنیا کے ادب میں ایک زندہ و جاوید شاہکار کا مرتبہ پا چکی ہے۔ ابلیس کے سارے فرزندوں کی ساری مساعی اس بات پر مرکوز ہے کہ پاکستان کی نئی نسل اقبال کی شاعری کے انقلابی مفہوم سے روشناس نہ ہونے پائے

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ نظم شیطان کو ایک اہم اور ہنگامی اجلاس کی صدارت کرتے دکھاتی ہے۔ اس اجلاس میں شیطان کے کارندے یا مشیر جو دنیا کے کونے کونے سے آئے ہیں :

اپنی اپنی شیطانی مہموں کو درپیش خطرات پیش کرتے ہیں اور باہم مشورہ کرتے ہیں کہ دنیا میں شیطانی تقاضوں کے فروغ کی خاطر کیا اقدامات کئے جائیں۔ آخر میں شیطان اپنی رائے دیتا ہے اور اپنے مشیروں کو اس خطرناک ترین چیلنج کی طرف متوجہ کرتا ہے جو دنیا میں شیطنیت کو درپیش ہے۔ اس نظم میں شیطان کا سیاسی کردار پوری طرح اُبھر کر سامنے آجاتا ہے۔

۱۹۳۶ء میں تخلیق ہونے والی اس نظم یا ۱۹۳۶ء میں منعقد ہونے والے ابلاسس کا آغاز ابلیس کے جن افتتاحی کلمات سے ہوتا ہے ان میں اس بات پر فخر کا اظہار کیا گیا ہے کہ ابلیس نے فرنگی کو ملوکیت کا خواب دکھلا کر مسجد و دیر و کلیسا کا افسوں توڑ دیا ہے۔ اور سرمایہ داری کے جنوں کو تیز کر کے غریبوں کو تقدیر پرستی کا سبق سکھا دیا ہے اس لئے اب دنیا میں سرمایہ داری کا پرانا درخت سرسبز و شاداب رہے گا۔ اس پر پہلا مشیر ابلیس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہتا ہے کہ صوفی و ملا ملوکیت کے غلام بن چکے ہیں۔ مومن کی تیغ بے نیام کند ہو کر رہ گئی ہے۔ اسلام کی انقلابی رُوح ختم ہو گئی ہے اور یہ رسمیات تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ اس لئے دنیا میں شیطنیت کا نظام مستحکم رہے گا۔

اس خوش فہمی پر تنقید کرتے ہوئے دوسرا مشیر ابلیس کو دنیا کے تازہ فتنے یعنی سلطانیٔ جمہور کے لئے جدوجہد کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ پہلا مشیر اعتماد کے ساتھ جواب دیتا ہے کہ سلطانیٔ جمہور کی یہ جدوجہد ملوکیت ہی کا ایک پردہ ہے ؎

ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس
جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خود نگر

کاروبارِ شہریاری کی حقیقت اور ہے
یہ وجودِ میر و سلطاں پر نہیں ہے منحصر

مجلسِ ملت ہو یا پرویز کا دربار ہو
ہے وہ سلطاں غیر کی کھیتی پہ ہو جس کی نظر

اس مرحلہ پر تیسرا مشیر شیطنیت کو درپیش ایک اور زبردست خطرے یعنی اشتراکیت کا ذکر کرتا ہے۔

کیا بتاؤں کیا ہے کافر کی نگاہ پردہ سوز
مشرق و مغرب کی قوموں کے لئے روزِ حساب

اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا طبیعت کا فساد
توڑ دی بندوں نے آقاؤں کے خیموں کی طناب

چوتھا مشیر کارل مارکس کے اشتراکی نظام کا توڑ مسولینی اور ہٹلر کی فاشزم کی صورت میں پیش کرتا ہے۔ مگر تیسرا مشیر اس دلیل سے متاثر نہیں ہوتا اور اشتراکیت کی بدولت مغربی استعمار کے بے نقاب ہو جانے پر نالاں ہے۔ پانچواں مشیر بھی شیطانی نظام کو درپیش اشتراکیت کے خطرے پر ابلیس کو متوجہ کرتا ہے ؎

گرچہ ہیں تیرے مرید افرنگ کے ساحر تمام
اب مجھے ان کی فراست پر نہیں ہے اعتبار

وہ یہودی فتنہ گر وہ روح مزدک کا بروز
ہر قبا ہونے کو ہے اس کے جنوں سے تار تار

چھا گئی آشفتہ ہو کر وسعتِ افلاک پر
جس کو نادانی میں ہم سمجھے تھے اک مشتِ غبار

فتنۂ فردا کی ہیبت کا یہ عالم ہے کہ آج
کانپتے ہیں کوہسار و مرغزار و جوئبار

میرے آقا! وہ جہاں زیر و زبر ہونے کو ہے
جس جہاں کا ہے فقط تیری سیادت پر مدار

اس پر ابلیس برہم ہو کر اپنے مشیروں سے مخاطب ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ دنیا میں شیطنیت کے لئے سب سے بڑا خطرہ اشتراکیت نہیں بلکہ اسلام ہے ؎

کب ڈرا سکتے ہیں مجھ کو اشتراکی کوچہ گرد
یہ پریشاں روزِ آشفتہ مغز، آشفتہ مُو

ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس امت کی بیداری سے ہے
جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو!

جانتا ہے جس پہ روشن باطنِ ایام ہے
مُزدکیت فتنۂ فردا نہیں اسلام ہے

اس کے بعد ابلیس اپنے مشیروں کو اس نئے خطرے یعنی اسلام کی رُوح انقلاب کے از سرِ نو ظہور سے آگاہ کرتا ہے ؎

عصرِ حاضر کے تقاضوں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبرؐ کہیں

الحذر آئین پیغمبر سے سو بار الحذر — حافظِ ناموسِ زن، مرد آزما، مرد آفریں
موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے — نے کوئی فغفور و خاقاں نے فقیر رہ نشیں
کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک صاف — منعموں کو مال و دولت کا بنایا ہے امیں
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب — بادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں
چشمِ عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب — یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محرومِ یقیں
ہے یہی بہتر الٰہیات میں الجھا رہے — یہ کتاب اللہ کی تاویلات میں اُلجھا رہے

ابلیس بتاتا ہے کہ وہ ہر آن مسلمانوں کی بیداری سے لرز رہا ہے اور مسلمانوں کو حقیقی اسلام سے دور رکھنے کی تدابیر سوچ رہا ہے۔ نظم کا یہ حصہ انتہائی حسین ہے اور اس میں اقبال نے ابلیس کی زبانی مسلمانوں کے عہدِ غلامی کی دینی سرگرمیوں یعنی الٰہیات کے ترشے ہوئے لات و منات کی پرستش پر بڑی جرأت سے تنقید کی ہے۔ ابلیس اپنے مشیروں کو حکم دیتا ہے کہ وہ اس خدا اندیش کی تاریک رات کو ہرگز روشن نہ ہونے دیں جس کی تکبیروں سے کائنات لرز اٹھتی ہو اور اسے عالمِ کردار سے بیگانہ رکھ کر علم الکلام کی لفظی موشگافیوں میں اُلجھائے رکھیں۔ کیونکہ ؎

خیر اسی میں ہے قیامت تک رہے مومن غلام — چھوڑ کر اوروں کی خاطر یہ جہانِ بے ثبات
ہے وہی شعر و تصوف اسکے حق میں خوب تر — جو چھپا دے اسکی آنکھوں سے تماشائے حیات
ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں — ہے حقیقت جس کے دیں کی احتسابِ کائنات
مست رکھو ذکر و فکرِ صبحگاہی میں اسے — پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

اقبال نے آج سے پینتیس برس پہلے شیطان کے سیاسی عزائم کے بارے میں جو پیش گوئی کی تھی وہ حرف بحرف سچی ثابت ہوئی۔ اقبال کے سیاسی فرزند کامیاب ہوئے اور طلوعِ آزادی کے تقریباً ربع صدی بعد بھی ہمارے ہاں اسلام رسمیات کے مجموعے کا نام ہے۔ اسلام کی

انقلابی تحریک کے نشاناتِ سفر ہنوز دھندلائے ہوئے ہیں۔ صوفی و ملا عالم کردار سے بیگانہ ہو کر کلام اللہ کے ساتھ ساتھ کلامِ اقبال کی عجیب و غریب تاویلات سے ملوکیت کی جڑیں مضبوط کر رہے ہیں اور حقیقی اسلام کے علاوہ اقبال کے تصورات کے اردگرد بھی وہ دُھند چھا گئی ہے کہ اقبال کی زیرِ نظر نظم کے اشعار کی تشریح اس انداز سے ہونے لگی ہے جیسے شیطان کے مکالمات شیطان کے منہ سے نہ نکلے ہوں اور یہ نظم ڈرامائی نظم نہ ہو۔ بلکہ براہ راست بیانیہ خطابی شاعری ہو۔ برسوں پہلے اقبال جب اسلام کی سامراج نواز تاویلات میں ہمہ تن محو دانشوروں کو شیطان کا آلۂ کار ثابت کرنے میں مصروف تھے۔ یہ بات ان کے گمان میں بھی نہ آئی ہو گی کہ ان کے بعد کی نسلوں کو کلامِ اقبال کی شیطانی تاویلات کے کریہہ منظر دیکھنے پڑیں گے۔

نظمیں

عقل اور دل :
ایک آرزو :
شمع و شاعر :
شکوہ :
والدہ مرحومہ کی یاد میں :
خضرِ راہ :
طلوعِ اسلام :
مسجد قرطبہ :
طارق کی دعا :
ذوق و شوق :
ساقی نامہ :
شعلۂ امید :
ابلیس کی مجلسِ شوریٰ :

عقل و دل

عقل نے ایک دن یہ دل سے کہا
بھولے بھٹکے کی رہ نما ہوں میں

ہوں زمیں پہ، گذر فلک پہ مرا
دیکھ تو کس قدر رسا ہوں میں

کام دنیا میں رہبری ہے مرا
مثلِ خضرِ خجستہ پا ہوں میں

ہوں مفسر کتاب ہستی کی
مظہر شانِ کبریا ہوں میں

بوند اک خون کی ہے تو، لیکن
غیرتِ لعلِ بے بہا ہوں میں

دل نے سُن کر کہا یہ سب سچ ہے
پر مجھے بھی تو دیکھ کیا ہوں میں

راز ہستی کو تو سمجھتی ہے
اور آنکھوں سے دیکھتا ہوں میں

ہے تجھے واسطہ مظاہر سے
اور باطن سے آشنا ہوں میں

علم تجھ سے، تو معرفت مجھ سے
تو خدا جُو، خدا نما ہوں میں

علم کی انتہا ہے بے تابی
اس مرض کی مگر دوا ہوں میں

شمع تو محفلِ صداقت کی
حسن کی بزم کا دیا ہوں میں

تو زمان و مکاں سے رشتہ بہ پا
طائرِ سدرہ آشنا ہوں میں

کس بلندی پہ ہے مقام مرا
عرشِ ربِّ جلیل کا ہوں میں

ایک آرزو

دنیا کی محفلوں سے اکتا گیا ہوں یارب
کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو

شورش سے بھاگتا ہوں دل ڈوبتا ہے میرا
ایسا سکوت جس پر تقریر بھی فدا ہو

مرتا ہوں خامشی پر یہ آرزو ہے میری
دامن میں کوہ کے اک چھوٹا سا جھونپڑا ہو

آزاد فکر سے ہوں عزلت میں دن گزاروں
دنیا کے غم کا دل سے کانٹا نکل گیا ہو

لذت سرود کی ہو چڑیوں کے چہچہوں میں
چشموں کی شورشوں میں باجا سا بج رہا ہو

گل کی کلی چٹک کر پیغام دے کسی کا
ساغر ذرا سا گویا مجکو جہاں نما ہو

ہو ہاتھ کا سرہانا سبزہ کا ہو بچھونا
شرمائے جس سے جلوت خلوت میں وہ ادا ہو

مانوس اس قدر ہو صورت سے میری بلبل
ننھے سے دل میں اسکے کھٹکا نہ کچھ مرا ہو

صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہوں
ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو

ہو دلفریب ایسا کہسار کا نظارہ
پانی بھی موج بن کر اٹھ اٹھ کے دیکھتا ہو

آغوش میں زمیں کی سویا ہوا ہو سبزہ
پھر پھر کے جھاڑیوں میں پانی چمک رہا ہو

پھولوں کو چھو رہی ہو جھک جھک کے گل کی ٹہنی
جیسے حسین کوئی آئینہ دیکھتا ہو

مہندی لگائے سورج جب شام کی دلہن کو
سرخی لئے سہری ہر پھول کی قبا ہو

راتوں کو چلنے والے رہ جائیں تھک کے جسدم
امید ان کی میرا ٹوٹا ہوا دیا ہو

بجلی چمک کے ان کو کٹیا مری دکھا دے
جب آسماں پہ ہر سو بادل گھرا ہوا ہو

پچھلے پہر کی کوئل، وہ صبح کی مؤذن
میں اس کا ہمنوا ہوں، وہ میری ہمنوا ہو

کانوں پہ ہو نہ میرے دیر و حرم کا احساں
روزن ہی جھونپڑی کا مجکو سحر نما ہو

پھولوں کو آئے جس دم شبنم وضو کرانے
رونا مرا وضو ہو، نالہ مری دعا ہو

اس خامشی میں جائیں اتنے بلند نالے
تاروں کے قافلے کو میری صدا درا ہو

ہر درد مند دل کو رونا مرا رلا دے
بے ہوش جو پڑے ہیں شاید انھیں جگا دے

شمع اور شاعر

شاعر

دوش می گفتم بہ شمع منزلِ ویرانِ خویش
گیسوئے تو از پرِ پروانہ دارد شانۂ

در جہاں مثلِ چراغِ لالۂ صحرا ستم
نے نصیبِ محفلے، نے قسمتِ کاشانۂ

مدتے مانندِ تو من ہم نفس می سوختم
در طوافِ شعلہ ام بالے نہ زد پروانۂ

می طپد صد جلوہ در جانِ امل فرسودِ من
برنمی خیزد ازیں محفلِ دلِ دیوانۂ

از کجا ایں آتشِ عالم فروز اندوختی
کرمکِ بے مایہ را سوزِ کلیم آموختی!

شمع

مجھ کو جو موجِ نفس دیتی ہے پیغامِ اجل
لب اسی موجِ نفس سے ہے نوا پیرا ترا

میں تو جلتی ہوں کہ ہے مضمر مری فطرت میں سوز
تو فروزاں ہے کہ پروانوں کو ہو سودا ترا

گریہ ساماں میں کہ میرے دل میں ہے طوفانِ اشک
تبسم افشاں تو کہ بزمِ گل میں ہو چرچا ترا

گل بدامن ہے مری شب کے لہو سے میری صبح
ہے ترے امروز سے نا آشنا فردا ترا

یوں تو روشن ہے مگر سوزِ دروں رکھتا نہیں
شعلہ ہے مثلِ چراغِ لالۂ صحرا ترا

سوچ تو دل میں لقب ساقی کا ہے زیبا تجھے؟
انجمن پیاسی ہے اور پیمانہ بے صہبا ترا

اور ہے تیرا شعار، آئینِ ملت اور ہے
زشت روئی سے تری آئینہ ہے رسوا ترا

کعبہ پہلو میں ہے، اور سودائی بیخانہ ہے
کس قدر شوریدہ سر ہے شوقِ بے پروا ترا!

قیس پیدا ہوں تری محفل میں یہ ممکن نہیں
تنگ ہے صحرا ترا، محمل ہے بے لیلا ترا

اے درِ تابندہ! اے پروردۂ آغوشِ موج!
لذّتِ طوفاں سے ہے ناآشنا دریا ترا

اب نوا پیرا ہے کیا؟ گلشن ہوا برہم ترا
بے محل تیرا ترنم، نغمہ بے موسم ترا

تھا جنھیں ذوقِ تماشا وہ تو رخصت ہو گئے
لے کے اب تو وعدۂ دیدارِ عام آیا تو کیا

انجمن سے وہ پرانے شعلہ آشام اٹھ گئے
ساقیا! محفل میں تو آتش بجام آیا تو کیا

آہ! جب گلشن کی جمعیت پریشاں ہو چکی
پھول کو باد بہاری کا پیام آیا تو کیا

آخرِ شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ
صبح دم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا

بجھ گیا وہ شعلہ جو مقصودِ ہر پروانہ تھا
اب کوئی سودائیِ سوزِ تمام آیا تو کیا

پھول بے پروا ہیں، تو گرم نوا ہو یا نہ ہو
کاروانِ بے حس ہے، آوازِ درا ہو یا نہ ہو

شمع محفل ہو کے تو جب سوز سے خالی رہا
تیرے پروانے کبھی اس لذّت سے بیگانے رہے

رشتۂ الفت میں جب ان کو پرو سکتا تھا تو
پھر پریشاں کیوں تری تسبیح کے دانے رہے؟

شوقِ بے پروا گیا، فکرِ فلک پیما گیا
تیری محفل میں نہ دیوانے نہ فرزانے رہے

وہ جگر سوزی نہیں، وہ شعلہ آشامی نہیں
فائدہ پھر کیا جو گردِ شمع پروانے رہے؟

خیر تو ساقی سہی، لیکن پلائے گا کسے؟
اب نہ وہ میکش رہے باقی نہ میخانے رہے!

رو رہی ہے آج، اک ٹوٹی ہوئی مینا اسے
کل تلک گردش میں جس ساقی کے پیمانے رہے!

آج ہیں خاموش وہ دشتِ جنوں پرور جہاں
رقص میں لیلا ہی، لیلا کے دیوانے رہے

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

جن کے ہنگاموں سے تھے آباد ویرانے کبھی
شہر اُن کے مٹ گئے آبادیاں بَن ہو گئیں

سطوتِ توحید قائم جن نمازوں سے ہوئی
وہ نمازیں ہند میں نذرِ برہمن ہو گئیں

دہر میں عیشِ دوام آئیں کی پابندی سے ہے
موج کو آزادیاں سامانِ شیون ہو گئیں

خود تجلی کو تمنا جن کے نظاروں کی تھی
وہ نگاہیں نا امیدِ نورِ ایمن ہو گئیں!

اُڑتی پھرتی تھیں ہزاروں بلبلیں گلزار میں
دل میں کیا آئی کہ پابندِ نشیمن ہو گئیں؟

وسعتِ گردوں میں تھی ان کی تڑپ نظارہ سوز
بجلیاں آسودۂ دامانِ خرمن ہو گئیں

دیدۂ خونبار ہو منت کشِ گلزار کیوں؟
اشکِ پیہم سے نگاہیں گل بدامن ہو گئیں

شامِ غم لیکن خبر دیتی ہے صبحِ عید کی
ظلمتِ شب میں نظر آئی کرن امید کی!

مژدہ اے پیمانہ بردارِ خمستانِ حجاز!
بعد مدت کے ترے رندوں کو پھر آیا ہے ہوش

نقدِ خودداری بہائے بادۂ اغیار تھی
پھر دکاں تیری ہے لبریزِ صدائے ناؤ نوش

ٹوٹنے کو ہے طلسمِ ماہ سیمایانِ ہند
پھر سلیمیٰ کی نظر دیتی ہے پیغامِ خروش

پھر یہ غوغا ہے کہ لاساقی شراب خانہ ساز
دل کے ہنگامے مئے مغرب نے کر ڈالے خموش

نغمہ پیرا ہو کہ یہ ہنگامِ خاموشی نہیں
ہے سحر کا آسماں خورشید سے مینا بدوش

در غمِ دیگر بسوز و دیگراں را ہم بسوز
گفتمت روشن حدیثے گر توانی دار گوش

کہہ گئے ہیں شاعری جزویست از پیغمبری
ہاں سنا دے محفلِ ملت کو پیغامِ سروش

آنکھ کو بیدار کر دے وعدۂ دیدار سے
زندہ کر دے دل کو سوزِ جوہرِ گفتار سے

رہزنِ ہمت ہوا ذوقِ تن آسانی ترا
بحر تھا صحرا میں تو گلشن میں مثلِ جو ہوا

اپنی اصلیت پہ قائم تھا تو جمعیت بھی تھی
چھوڑ کر گل کو پریشاں کاروانِ بو ہوا

زندگی قطرے کو سکھلاتی ہے اسرارِ حیات
یہ کبھی گوہر، کبھی شبنم، کبھی آنسو ہوا

پھر کہیں سے اس کو پیدا کر بڑی دولت ہے یہ
زندگی کیسی جو دل بیگانۂ پہلو ہوا

آبرو باقی تری ملت کی جمعیت سے تھی
جب یہ جمعیت گئی، دنیا میں رسوا تو ہوا

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں، اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

پردۂ دل میں محبت کو ابھی مستور رکھ
یعنی اپنی مے کو رسوا صورتِ مینا نہ کر

خیمہ زن ہو وادیٔ سینا میں مانندِ کلیم
شعلۂ عشق کو غارت گرِ کاشانہ کر

شمع کو بھی ہو ذرا معلوم انجامِ ستم
صرفِ تعمیرِ سحر خاکسترِ پروانہ کر

تو اگر خود دار ہے منت کشِ ساقی نہ ہو
عین دریا میں حباب آسا نگوں پیمانہ کر

کیفیت باقی پرانے کوہ و صحرا میں نہیں
ہے جنوں تیرا نیا، پیدا نیا ویرانہ کر

خاک میں تجھ کو مقدر نے ملایا ہے اگر
تو عصا افتاد سے پیدا مثالِ دانہ کر

ہاں! اسی شاخِ کہن پر پھر بنا لے آشیاں
اہلِ گلشن کو شہیدِ نغمۂ مستانہ کر

اس چمن میں پیروِ بلبل ہو یا تلمیذِ گل
یا سراپا نالہ بن جا، یا نوا پیدا نہ کر

کیوں چمن میں بے صدا مثلِ رمِ شبنم ہے تو
لب کشا ہو جا سرودِ بربطِ عالم ہے تو

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں! ذرا
دانہ تو، کھیتی بھی تو، باراں بھی تو، حاصل بھی تو

آہ! کس کی جستجو آوارہ رکھتی ہے تجھے
راہ تو، رہرو بھی تو، رہبر بھی تو، منزل بھی تو

کانپتا ہے دل ترا اندیشۂ طوفاں سے کیا
ناخدا تو، بحر تو، کشتی بھی تو، ساحل بھی تو

دیکھ آکر کوچۂ چاک گریباں میں کبھی!
قیس تو، لیلیٰ بھی تو، صحرا بھی تو، محمل بھی تو

شعلہ بن کر پھونک دے خاشاکِ غیر اللہ کو
خوفِ باطل کیا؟ کہ ہے غارتگرِ باطل بھی تو

بے خبر! تو جوہرِ آئینۂ ایام ہے
تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے!

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تو
قطرہ ہے، لیکن مثالِ بحرِ بے پایاں بھی ہے

کیوں گرفتارِ طلسمِ ہیچ مقداری ہے تو
دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکتِ طوفاں بھی ہے!

سینہ ہے تیرا امیں اس کے پیامِ ناز کا
جو نظامِ دہر میں پیدا بھی ہے پنہاں بھی ہے

ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ
تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے

اب تلک شاہد ہے جس پر کوہِ فاراں کا سکوت
اے تغافل پیشہ! تجھ کو یاد وہ پیماں بھی ہے؟

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیِ داماں بھی ہے

دل کی کیفیت ہے پیدا پردۂ تقدیر میں
کسوتِ مینا میں ہے مستور بھی عریاں بھی ہے

پھونک ڈالا ہے مری آتش نوائی نے مجھے
اور میری زندگانی کا یہی ساماں بھی ہے

رازِ اس آتش نوائی کا مرے سینے میں دیکھ
جلوۂ تقدیر میرے دل کے آئینے میں دیکھ!

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمتِ رات کی سیماب پا ہو جائے گی!

اس قدر ہوگی ترنم آفریں بادِ بہار
نکہتِ خوابیدہ غنچے کی نوا ہو جائے گی!

آئیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک
بزمِ گل کی ہم نفس بادِ صبا ہو جائے گی!

شبنم افشانی مری پیدا کرے گی سوز و ساز
اس چمن کی ہر کلی درد آشنا ہو جائے گی!

دیکھ لو گے سطوتِ رفتارِ دریا کا کمال
موجِ مضطر ہی اسے زنجیر پا ہو جائے گی!

پھر دلوں کو یاد آجائے گا پیغامِ سجود
پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی!

نالۂ صیاد سے ہوں گے نوا ساماں طیور
خونِ گلچیں سے کلی رنگیں قبا ہو جائے گی!

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی!

شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے!
یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے!!

شکوہ

کیوں زیاں کار بنوں سود فراموش رہوں
فکرِ فردا نہ کروں، محوِ غمِ دوش رہوں

نالے بلبل کے سنوں اور ہمہ تن گوش رہوں
ہم نوا، میں بھی کوئی گل ہوں کہ خاموش رہوں

جرأت آموز مری تابِ سخن ہے مجھ کو
شکوہ اللہ سے خاکم بہ دہن ہے مجھ کو

ہے بجا شیوۂ تسلیم میں مشہور ہیں ہم
قصّۂ درد سناتے ہیں کہ مجبور ہیں ہم

ساز خاموش ہیں، فریاد سے معمور ہیں ہم
نالہ آتا ہے اگر لب پہ تو معذور ہیں ہم

اے خدا! شکوۂ اربابِ وفا بھی سُن لے
خوگرِ حمد سے تھوڑا سا گِلہ بھی سُن لے

تھی تو موجود ازل سے ہی تری ذات قدیم
پھول تھا زیبِ چمن، پر نہ پریشاں تھی شمیم
شرطِ انصاف ہے اے صاحبِ الطافِ عمیم
بوئے گل پھیلتی کس طرح جو ہوتی نہ نسیم
ہم کو جمعیتِ خاطر یہ پریشانی تھی
ورنہ اُمّت ترے محبوب کی دیوانی تھی

ہم سے پہلے تھا عجب تیرے جہاں کا منظر
کہیں مسجود تھے پتھر، کہیں معبود شجر
خوگرِ پیکرِ محسوس تھی انساں کی نظر
مانتا پھر کوئی اَن دیکھے خدا کو کیوں کر
تجھ کو معلوم ہے لیتا تھا کوئی نام ترا
قوتِ بازوئے مسلم نے کیا کام ترا

بس رہے تھے یہیں سلجوق بھی، تورانی بھی
اہلِ چیں، چین میں، ایران میں ساسانی بھی
اسی معمورے میں آباد تھے یونانی بھی
اسی دنیا میں یہودی بھی تھے نصرانی بھی
پر ترے نام پہ تلوار اُٹھائی کس نے
بات جو بگڑی ہوئی تھی، وہ بنائی کس نے

تھے ہمیں ایک ترے معرکہ آراؤں میں
خشکیوں میں کبھی لڑتے، کبھی دریاؤں میں
دیں اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں
کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں
شان آنکھوں میں نہ جچتی تھی جہاں داروں کی
کلمہ پڑھتے تھے ہم چھاؤں میں تلواروں کی

ہم تو جیتے تھے، تو جنگوں کی مصیبت کے لئے
اور مرتے تھے ترے نام کی عظمت کے لئے
تھی نہ کچھ تیغ زنی اپنی حکومت کے لئے
سر بہ کف پھرتے تھے کیا دہر میں دولت کے لئے

قوم اپنی جو زر و مالِ جہاں پر مرتی
بُت فروشی کے عوض بُت شکنی کیوں کرتی

ٹل نہ سکتے تھے، اگر جنگ میں اڑ جاتے تھے
پاؤں شیروں کے بھی میداں سے اُکھڑ جاتے تھے
تجھ سے سرکش ہوا کوئی، تو بگڑ جاتے تھے
تیغ کیا چیز ہے، ہم توپ سے لڑ جاتے تھے

نقش توحید کا ہر دِل میں بٹھایا ہم نے
زیرِ خنجر بھی یہ پیغام سُنایا ہم نے

تو ہی کہہ دے کہ اکھاڑا درِ خیبر کس نے؟
شہر قیصر کا جو تھا اس کو کیا سر کس نے؟
توڑے مخلوق خداوندوں کے پیکر کس نے؟
کاٹ کر رکھ دیے کفار کے لشکر کس نے؟

کس نے ٹھنڈا کیا آتش کدہ ایراں کو
کس نے پھر زندہ کیا تذکرۂ یزداں کو

کون سی قوم فقط تیری طلب گار ہوئی
اور تیرے لئے زحمت کشِ پیکار ہوئی
کِس کی شمشیر جہاں گیر جہاں دار ہوئی
کِس کی تکبیر سے دنیا تری بیدار ہوئی

کِس کی ہیبت سے صنم سہمے ہوئے رہتے تھے
مُنہ کے بل گر کے ھو اللہ احد کہتے تھے

آگیا عین لڑائی میں اگر وقتِ نماز
قبلہ رو ہو کے زمیں بوس ہوئی قوم حجاز
ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تیری سرکار میں پہونچے تو سبھی ایک ہوئے

محفل کون و مکاں میں سحر و شام پھرے
مئے توحید کو لے کر صفتِ جام پھرے
کوہ میں، دشت میں لے کر ترا پیغام پھرے
اور معلوم ہے تجھ کو کبھی ناکام پھرے؟

دشت تو دشت ہیں، دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحر ظلمات میں دوڑا دیے گھوڑے ہم نے

صفحہ دہر سے باطل کو مٹایا ہم نے
نوع انساں کو غلامی سے چھڑایا ہم نے
تیرے کعبے کو جبینوں سے بسایا ہم نے
تیرے قرآن کو سینوں سے لگایا ہم نے

پھر بھی ہم سے یہ گلہ ہے کہ وفادار نہیں
ہم وفادار نہیں، تو بھی تو دلدار نہیں

اُمتیں اور بھی ہیں، ان میں گنہگار بھی ہیں
عجز والے بھی ہیں، مست مئے پندار بھی ہیں
ان میں کاہل بھی ہیں، غافل بھی ہیں، ہشیار بھی ہیں
سیکڑوں ہیں کہ ترے نام سے بیزار بھی ہیں

رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر

بُت صنم خانے میں کہتے ہیں مسلمان گئے
ہے خوشی ان کو کہ کعبے کے نگہبان گئے
منزل دہر سے اونٹوں کے حدی خوان گئے
اپنی بغلوں میں دبائے ہوئے قرآن گئے

خندہ زن کفر ہے، احساس تجھے ہے کہ نہیں
اپنی توحید کا کچھ پاس تجھے ہے کہ نہیں

یہ تسکایت نہیں، ہیں ان کے خزانے معمور
نہیں محفل میں جنھیں بات بھی کرنے کا شعور
قہر تو یہ ہے کہ کافر کو ملیں حور و قصور
اور بے چارے مسلمانوں کو فقط وعدۂ حور

اب وہ الطاف نہیں، ہم پہ عنایات نہیں
بات یہ کیا ہے کہ پہلی سی مدارات نہیں

کیوں مسلمانوں میں ہے دولت دنیا نایاب
تیری قدرت تو ہے وہ جس کی نہ حد ہے نہ حساب
تو جو چاہے تو اُٹھے سینۂ صحرا سے حباب
رہروِ دشت ہو سیلی زدۂ موج سراب

طعن اغیار ہے رسوائی ہے ناداری ہے
کیا ترے نام پہ مرنے کا عوض خواری ہے

بنی اغیار کی اب چاہنے والی دنیا
رہ گئی اپنے لئے ایک خیالی دنیا
ہم تو رخصت ہوئے اوروں نے سنبھالی دنیا
پھر نہ کہنا ہوئی توحید سے خالی دنیا

ہم تو جیتے ہیں کہ دنیا میں ترا نام رہے
کہیں ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے جام رہے

تیری محفل بھی گئی، چاہنے والے بھی گئے
شب کی آہیں بھی گئیں صبح کے نالے بھی گئے
دل تجھے دے بھی گئے، اپنا صلہ لے بھی گئے
آکے بیٹھے بھی نہ تھے اور نکالے بھی گئے

آئے عشاق، گئے وعدۂ فردا لے کر
اب انھیں ڈھونڈ چراغ رخِ زیبا لے کر

درد لیلیٰ بھی وہی، قیس کا پہلو بھی وہی
نجد کے دشت و جبل میں رم آہو بھی وہی
عشق کا دل بھی وہی، حسن کا جادو بھی وہی
اُمتِ احمدِ مرسل بھی وہی، تو بھی وہی

پھر یہ آزردگیٔ غیر سبب کیا معنی
اپنے شیدا دُں پہ یہ چشمِ غضب کیا معنی

تجھ کو چھوڑا کہ رسولؐ عربی کو چھوڑا — بُت گری پیشہ کیا؟ بُت شکنی کو چھوڑا؟
عشق کو عشق کی آشفتہ سری کو چھوڑا — رسمِ سلمانؓ و اویسؓ قرنی کو چھوڑا؟

آگ تکبیر کی سینوں میں دبی رکھتے ہیں
زندگی مثلِ بلالِ حبشیؓ رکھتے ہیں

عشق کی خیر، وہ پہلی سی ادا بھی نہ سہی — جادہ پیمائیٔ تسلیم و رضا بھی نہ سہی
مضطرب دل صفت قبلہ نما بھی نہ سہی — اور پابندیٔ آئین وفا بھی نہ سہی

کبھی ہم سے کبھی غیروں سے شناسائی ہے
بات کہنے کی نہیں تو بھی تو ہرجائی ہے

سرخاراں پہ کیا دین کو کامل تو نے — اک اشارے میں ہزاروں کے لئے دل تو نے
آتشِ اندوز کیا عشق کا حاصل تو نے — پھونک دی گرمیٔ رخسار سے محفل تو نے

آج کیوں سینے ہمارے شررآباد نہیں
ہم وہی سوختہ ساماں ہیں تجھے یاد نہیں

وادیٔ نجد میں وہ شورِ سلاسل نہ رہا — قیس دیوانہ نظارۂ محمل نہ رہا
حوصلے وہ نہ رہے، ہم نہ رہے، دل نہ رہا — گھر یہ اجڑا ہے کہ تو رونقِ محفل نہ رہا

اے خوش آں روز کہ آئی و بہ صد ناز آئی
بے حجابانہ سوئے محفلِ ما باز آئی

بادہ کش غیر ہیں گلشن میں لب جو بیٹھے
سنتے ہیں جام بہ کف نغمۂ کو بیٹھے
دَورِ ہنگامۂ گل زار سے یک سو بیٹھے
تیرے دیوانے بھی ہیں منتظر ہُو بیٹھے

اپنے پروانوں کو پھر ذوق خود افروزی دے
برق دیرینہ کو فرمانِ جگر سوزی دے

قوم آوارہ عناں تاب ہے پھر سوئے حجاز
لے اُڑا بُلبلِ بے پر کو مذاقِ پرواز
مضطرب باغ کے ہر غنچے میں ہے بوئے نیاز
تو ذرا چھیڑ تو دے تشنۂ مضراب ہے ساز

نغمے بے تاب ہیں تاروں سے نکلنے کے لئے
طور مضطر ہے اسی آگ میں جلنے کے لئے

مشکلیں اُمّتِ مرحوم کی آساں کر دے
مورِ بے مایہ کو ہم دوشِ سلیماں کر دے
جنسِ نایابِ محبت کو پھر ارزاں کر دے
ہند کے دیر نشینوں کو مسلماں کر دے

جوئے خوں می چکد از حسرتِ دیرینۂ ما
می تپد نالہ بہ نشتر کدۂ سینۂ ما

بوئے گل لے گئی بیرونِ چمن راز چمن
کیا قیامت ہے کہ خود پھول ہیں غمّاز چمن
عہدِ گل ختم ہوا، ٹوٹ گیا ساز چمن
اُڑ گئے ڈالیوں سے زمزمہ پرداز چمن

ایک بلبل ہے کہ ہے محوِ ترنم اب تک
اس کے سینے میں ہے نغموں کا تلاطم اب تک

قمریاں شاخِ صنوبر سے گریزاں بھی ہوئیں
پتیاں پھول کی جھڑ جھڑ کے پریشاں بھی ہوئیں
وہ پرانی روشیں باغ کی ویراں بھی ہوئیں
ڈالیاں پیرہنِ برگ سے عریاں بھی ہوئیں

قیدِ موسم سے طبیعت رہی آزاد اس کی
کاش گلشن میں سمجھتا کوئی فریاد اس کی

لطف مرنے میں ہے باقی، نہ مزا جینے میں
کچھ مزا ہے تو یہی خونِ جگر پینے میں

کتنے بے تاب ہیں جوہر مرے آئینے میں
کس قدر جلوے تڑپتے ہیں مرے سینے میں

اس گلستاں میں مگر دیکھنے والے ہی نہیں
داغ جو سینے میں رکھتے ہوں وہ لالے ہی نہیں

چاک اس بلبلِ تنہا کی نوا سے دل ہوں
جاگنے والے اسی بانگِ درا سے دل ہوں

یعنی پھر زندہ نئے عہدِ وفا سے دل ہوں
پھر اسی بادۂ دیرینہ کے پیاسے دل ہوں

عجمی خم ہے تو کیا، مئے تو حجازی ہے مری
نغمہ ہندی ہے تو کیا، لے تو حجازی ہے مری

والدہ مرحومہ کی یاد میں

ذرّہ ذرّہ دہر کا زندانیٔ تقدیر ہے
پردۂ مجبوری و بیچارگیٔ تدبیر ہے

آسماں مجبور ہے، شمس و قمر مجبور ہیں
انجمِ سیماب پا رفتار پر مجبور ہیں

ہے شکست انجام غنچے کا سبو گلزار میں
سبزہ و گل بھی ہیں مجبورِ نمو گلزار میں

نغمۂ بلبل ہو یا آوازِ خاموشِ ضمیر
ہے اسی زنجیر عالمگیر میں ہر شے اسیر

آنکھ پر ہوتا ہے جب یہ سرِّ مجبوری عیاں
خشک ہو جاتا ہے دل میں اشک کا سیلِ رواں

قلبِ انسانی میں رقصِ عیش و غم رہتا نہیں
نغمہ رہ جاتا ہے، لطفِ زیر و بم رہتا نہیں

علم و حکمت رہزنِ سامانِ اشک و آہ ہے
یعنی اک الماس کا ٹکڑا دلِ آگاہ ہے

گرچہ میرے باغ میں شبنم کی شادابی نہیں
آنکھ میری مایہ دارِ اشکِ عنّابی نہیں

جانتا ہوں آہ! میں آلامِ انسانی کا راز
ہے نوائے شکوہ سے خالی مری فطرت کا ساز

میرے لب پر قصۂ نیرنگیِ دوراں نہیں
دل مرا حیراں نہیں، خندہ نہیں، گریاں نہیں

پر تری تصویر قاصد گریۂ پیہم کی ہے
آہ! یہ تردید میری حکمتِ محکم کی ہے

گریۂ سرشار سے بنیادِ جاں پائندہ ہے
درد کے عرفاں سے عقلِ سنگدل شرمندہ ہے

موجِ دودِ آہ سے آئینہ ہے روشن مرا
گنجِ آبِ آورد سے معمور ہے دامن مرا

حیرتی ہوں میں تری تصویر کے اعجاز کا
رخ بدل ڈالا ہے جس نے وقت کی پرواز کا

رفتہ و حاضر کو گویا پا بپا اس نے کیا
عہدِ طفلی سے مجھے پھر آشنا اس نے کیا

جب ترے دامن میں پلتی تھی وہ جانِ ناتواں
بات سے اچھی طرح محرم نہ تھی جس کی زباں

اور اب چرچے ہیں جس کی شوخیِ گفتار کے
بے بہا موتی ہیں جس کی چشمِ گوہر بار کے

علم کی سنجیدہ گفتاری، بڑھاپے کا شعور
دنیوی اعزاز کی شوکت، جوانی کا غرور

زندگی کی اوج گاہوں سے اتر آتے ہیں ہم
صحبتِ مادر میں طفلِ سادہ رہ جاتے ہیں ہم

بے تکلف خندہ زن ہیں، فکر سے آزاد ہیں
پھر اسی کھوئے ہوئے فردوس میں آباد ہیں

کس کو اب ہوگا وطن میں آہ! میرا انتظار؟ — کون میرا خط نہ آنے سے رہے گا بے قرار؟
خاک مرقد پر تری لے کر یہ فریاد آؤں گا — اب دعائے نیم شب میں کس کو میں یاد آؤنگا؟
تربیت سے تیری میں انجم کا ہم قسمت ہوا — گھر مرے اجداد کا سرمایۂ عزت ہوا
دفتر ہستی میں تھی زرّیں ورق تیری حیات — تھی سراپا دین و دنیا کا سبق تیری حیات
عمر بھی تیری محبت میں تری خدمت گر رہی — میں تری خدمت کے قابل جب ہوا تو چل بسی
وہ جواں قامت میں ہے جو صورتِ سروِ بلند — تیری خدمت سے ہوا جو مجھ سے بڑھ کر بہرہ مند
کاروبارِ زندگانی میں وہ ہم پہلو مرا — وہ محبت میں تری تصویر، وہ بازو مرا
تجھ کو مثلِ طفلکِ بیدست و پا روتا ہے وہ — صبر سے نا آشنا صبح و مسا روتا ہے وہ

تخم جس کا تو ہماری کشتِ جاں میں بو گئی
شرکتِ غم سے وہ الفت اور محکم ہو گئی

آہ! یہ دنیا، یہ ماتم خانۂ برنا و پیر — آدمی ہے کس طلسمِ دوش و فردا میں اسیر
کتنی مشکل زندگی ہے! کس قدر آساں ہے موت! — گلشنِ ہستی میں مانندِ نسیم ارزاں ہے موت!
زلزلے ہیں، بجلیاں ہیں، قحط ہیں، آلام ہیں — کیسی کیسی دخترانِ مادرِ ایام ہیں!
کلبۂ افلاس میں، دولت کے کاشانے میں موت — دشت و در میں، شہر میں، گلشن میں، ویرانے میں موت
موت ہے ہنگامہ آرا قلزمِ خاموش میں — ڈوب جاتے ہیں سفینے موج کی آغوش میں
نے مجالِ شکوہ ہے نے طاقتِ گفتار ہے — زندگانی کیا ہے، اک طوقِ گلو افشار ہے

قافلے میں غیر فریادِ درا کچھ بھی نہیں
اک متاعِ دیدۂ تر کے سوا کچھ بھی نہیں

ختم ہو جائے گا لیکن امتحاں کا دور بھی
ہیں پسِ نُہ پردۂ گردوں ابھی دور اور بھی

سینہ چاک اس گلستاں میں لالہ و گل ہیں تو کیا؟
نالہ و فریاد پر مجبور بلبل ہیں تو کیا؟

جھاڑیاں جن کے قفس میں قید ہے آہِ خزاں
سبز کر دے گی انھیں بادِ بہارِ جاوداں

خفتہ خاکِ پے سپر میں ہے شرار اپنا تو کیا؟
عارضی محمل ہے یہ مشتِ غبار اپنا تو کیا؟

زندگی کی آگ کا انجام خاکستر نہیں
ٹوٹنا جس کا مقدر ہو یہ وہ گوہر نہیں

زندگی محبوب ایسی دیدۂ قدرت میں ہے
ذوقِ حفظِ زندگی ہر چیز کی فطرت میں ہے

موت کے ہاتھوں سے مٹ سکتا اگر نقشِ حیات
عام یوں اس کو نہ کر دیتا نظامِ کائنات

ہے اگر ارزاں تو یہ سمجھو اجل کچھ بھی نہیں
جس طرح سونے سے جینے میں خلل کچھ بھی نہیں

آہ! غافل! موت کا رازِ نہاں کچھ اور ہے!
نقش کی ناپائداری سے عیاں کچھ اور ہے!

جنتِ نظارہ ہے نقشِ ہوا بالائے آب
موجِ مضطر توڑ کر تعمیر کرتی ہے حباب

موج کے دامن میں پھر اسکو چھپا دیتی ہے یہ
کتنی بے دردی سے نقش اپنا مٹا دیتی ہے یہ

پھر نہ کر سکتی حباب اپنا اگر پیدا ہوا
توڑنے میں اس کے یوں ہوتی نہ بے پروا ہوا

اس روش کا کیا اثر ہے ہیئتِ تعمیر پر؟
یہ تو حجت ہے ہوا کی قوتِ تعمیر پر

فطرتِ ہستی شہیدِ آرزو رہتی نہ ہو
خوب تر پیکر کی اس کو جستجو رہتی نہ ہو

آہ! سیمابِ پریشاں، انجمِ گردوں فروز
شوخ یہ چنگاریاں، ممنونِ شب ہے جن کا سوز

عقل جس سے سر بہ زانو ہے وہ مدت ان کی ہے
سرگزشتِ نوعِ انساں ایک ساعت ان کی ہے!

پھر یہ انساں آں سوئے افلاک ہے جس کی نظر
قدسیوں سے بھی مقاصد میں ہے جو پاکیزہ تر

جو مثالِ شمع روشن محفلِ قدرت میں ہے
آسماں اک نقطہ جس کی وسعتِ فطرت میں ہے

جس کی نادانی صداقت کے لئے بیتاب ہے
جس کا ناخن سازِ ہستی کے لئے مضراب ہے

شعلہ یہ کمتر ہے گردوں کے شراروں سے بھی کیا؟
کم بہا ہے آفتاب اپنا ستاروں سے بھی کیا؟

تخمِ گل کی آنکھ زیرِ خاک بھی بیخواب ہے
کس قدر نشو و نما کے واسطے بیتاب ہے

زندگی کا شعلہ اس دانے میں جو مستور ہے
خود نمائی، خود فزائی کے لئے مجبور ہے

سردیٔ مرقد سے بھی افسردہ ہو سکتا نہیں
خاک میں دب کر بھی اپنا سوز کھو سکتا نہیں!

پھول بن کر اپنی تربت سے نکل آتا ہے یہ
موت سے گویا قبائے زندگی پاتا ہے یہ!

ہے لحد اس قوتِ آشفتہ کی شیرازہ بند
ڈالتی ہے گردنِ گردوں میں جو اپنی کمند

موت تجدیدِ مذاقِ زندگی کا نام ہے
خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے!

خوگرِ پرواز کو پرواز میں ڈر کچھ نہیں!
موت اس گلشن میں جز بیجیدنِ پر کچھ نہیں!

کہتے ہیں اہلِ جہاں درد اجل بے لا دوا
زخمِ فرقت وقت کے مرہم سے پاتا ہے شفا

دل مگر غم مرنے والوں کا جہاں آباد ہے
حلقۂ زنجیرِ صبح و شام سے آزاد ہے

وقت کے افسوں سے تھمتا نالۂ ماتم نہیں
وقت زخمِ تیغِ فرقت کا کوئی مرہم نہیں

سر پہ آجاتی ہے جب کوئی مصیبت ناگہاں
اشکِ پیہم دیدۂ انساں سے ہوتے ہیں رواں

ربط ہو جاتا ہے دل کو نالہ و فریاد سے
خونِ دل بہتا ہے آنکھوں کی سرشک آباد سے

آدمی تابِ شکیبائی سے گو محروم ہے
اس کی فطرت میں یہ اک احساسِ نامعلوم ہے

جوہرِ انساں عدم سے آشنا ہوتا نہیں
آنکھ سے غائب تو ہوتا ہے فنا ہوتا نہیں

رختِ ہستی خاک، غم کی شعلہ افشانی سے ہے
سرد یہ آگ اس لطیف احساس کے پانی سے ہے

آہ! یہ ضبطِ فغاں غفلت کی خاموشی نہیں
آگہی ہے یہ دلاسائی، فراموشی نہیں

پردۂ مشرق سے جس دم جلوہ گر ہوتی ہے صبح
داغ شب کا دامنِ آفاق سے دھوتی ہے صبح

لالۂ افسردہ کو آتش قبا کرتی ہے یہ
بے زباں طائر کو سرمستِ نوا کرتی ہے یہ

سینۂ بلبل کے زنداں سے سرود آزاد ہے
سیکڑوں نغموں سے بادِ صبحدم آباد ہے

خفتگانِ لالہ زار و کوہسار و رود بار
ہوتے ہیں آخر عروسِ زندگی سے ہمکنار

یہ اگر آئینِ ہستی ہے کہ ہو ہر شام صبح
مرقدِ انساں کی شب کا کیوں نہ ہو انجام صبح!

دامِ سیمینِ تخیل ہے مرا آفاق گیر
کر لیا ہے جس سے تیری یاد کو میں نے اسیر!

یاد سے تیری دلِ درد آشنا معمور ہے
جیسے کعبہ میں دعاؤں سے فضا معمور ہے!

وہ فرائض کا تسلسل نام ہے جس کا حیات
جلوہ گاہیں اس کی ہیں لاکھوں جہانِ بے ثبات

مختلف ہر منزلِ ہستی کی رسم و راہ ہے
آخرت بھی زندگی کی ایک جولاں گاہ ہے!

ہے وہاں بے حاصلی کشتِ اجل کے واسطے
سازگار آب و ہوا تخمِ عمل کے واسطے

نورِ فطرت ظلمتِ پیکر کا زندانی نہیں
تنگ ایسا حلقۂ افکارِ انسانی نہیں

زندگانی تھی تری مہتاب سے تابندہ تر
خوب تر تھا صبح کے تارے سے بھی تیرا سفر

مثلِ ایوانِ سحر مرقدِ فرزاں ہو ترا! نور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو ترا!
آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے!
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے!

خضرِ راہ

شاعر

ساحلِ دریا پہ میں اک رات تھا محوِ نظر گوشۂ دل میں چھپائے اک جہانِ اضطراب
شب سکوت افزا، ہوا آسودہ، دریا نرم سیر تھی نظر حیراں کہ یہ دریا ہے یا تصویرِ آب
جیسے گہوارے میں سو جاتا ہے طفلِ شیر خوار موجِ مضطر تھی کہیں گہرائیوں میں مست خواب
رات کے افسوں سے طائر آشیانوں میں اسیر انجم کم مایہ گرفتارِ طلسمِ ماہتاب
دیکھتا کیا ہوں کہ وہ پیکِ جہاں پیما خضر جس کی پیری میں ہے مانندِ سحر رنگِ شباب
کہہ رہا ہے مجھ سے اے جویائے اسرارِ ازل چشمِ دل وا ہو تو ہے تقدیرِ عالم بے حجاب
پختہ تر ہے گردشِ پیہم سے جامِ زندگی
ہے یہی اے بے خبر رازِ دوامِ زندگی

اے تری چشمِ جہاں بیں پر وہ طوفاں آشکار جن کے ہنگامے ابھی دریا میں سوتے ہیں خموش

"کشتیٔ مسکیں"، و "جانِ پاک" و "دیوارِ یتیم"
علم موسیٰ بھی ترے سامنے حیرت فروش

چھوڑ کر آبادیاں رہتا ہے تو صحرا نورد
زندگی تیری ہے بے روز و شب و فردا و دوش

زندگی کا راز کیا ہے؟ سلطنت کیا چیز ہے؟
اور یہ سرمایہ و محنت میں ہے کیسا خروش؟

ہو رہا ہے ایشیا کا خرقۂ دیرینہ چاک
نوجوان اقوامِ نو دولت کے ہیں پیرایہ پوش

گرچہ اسکندر رہا محرومِ آبِ زندگی
فطرتِ اسکندری اب تک ہے گرم ناؤ نوش

بیچتا ہے ہاشمی ناموسِ دینِ مصطفےٰ
خاک و خوں میں مل رہا ہے ترکمانِ سخت کوش

آگ ہے اولادِ ابراہیم ہے نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے

جوابِ خضر

صحرانوردی

کیوں تعجب ہے مری صحرانوردی پہ تجھے
یہ تگاپوئے دمادم زندگی کی ہے دلیل

اے رہینِ خانہ تو نے وہ سماں دیکھا نہیں
گونجتی ہے جب فضائے دشت میں بانگِ رحیل

ریت کے ٹیلے پہ وہ آہو کا بے پروا خرام
وہ خفر بے برگ و ساماں وہ سفر بے سنگ و میل

وہ نمود اختر سیماب پا ہنگامِ صبح
یا نمایاں بامِ گردوں سے جبینِ جبرئیل!

وہ سکوتِ شامِ صحرا میں غروبِ آفتاب
جس سے روشن تر ہوئی چشمِ جہاں بینِ خلیل

اور وہ پانی کے چشمے پر مقامِ کارواں
اہلِ ایماں جس طرح جنت میں گردِ سلسبیل

"کشتیٔ مسکیں"، و "جانِ پاک" و "دیوارِ یتیم"
علم موسیٰ بھی ترے سامنے حیرت فروش

چھوڑ کر آبادیاں رہتا ہے تو صحرا نورد
زندگی تیری ہے بے روز و شب و فردا و دوش

زندگی کا راز کیا ہے؟ سلطنت کیا چیز ہے؟
اور یہ سرمایہ و محنت میں ہے کیسا خروش؟

ہو رہا ہے ایشیا کا خرقہ دیرینہ چاک
نوجوان اقوامِ نو دولت کے ہیں پیرایہ پوش

گرچہ اسکندر رہا محرومِ آبِ زندگی
فطرتِ اسکندری اب تک ہے گرم ناؤ نوش

بیچتا ہے ہاشمی ناموسِ دینِ مصطفیٰ
خاک و خوں میں مل رہا ہے ترکمانِ سخت کوش

آگ ہے اولادِ ابراہیم ہے نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے

جوابِ خضر

صحرانوردی

کیوں تعجب ہے مری صحرانوردی پہ تجھے
یہ تگاپوئے دمادم زندگی کی ہے دلیل

اے رہینِ خانہ تو نے وہ سماں دیکھا نہیں
گونجتی ہے جب فضائے دشت میں بانگِ رحیل

ریت کے ٹیلے پہ وہ آہو کا بے پروا خرام
وہ خفر بے برگ و ساماں وہ سفر بے سنگ و میل

وہ نمود اختر سیماب پا ہنگامِ صبح
یا نمایاں بامِ گردوں سے جبینِ جبرئیل!

وہ سکوتِ شامِ صحرا میں غروبِ آفتاب
جس سے روشن تر ہوئی چشمِ جہاں بینِ خلیل!

اور وہ پانی کے چشمے پر مقامِ کارواں
اہلِ ایماں جس طرح جنت میں گردِ سلسبیل

تازہ ویرانے کی سودائے محبت کو تلاش
اور آبادی میں تو زنجیریٔ کشت و نخیل!

دل میں یہ سُن کر بپا ہنگامۂ محشر ہوا!
میں شہید جستجو تھا یوں سخن گستر ہوا

زندگی

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی

زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگ گراں ہے زندگی

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی

آشکارا ہے یہ اپنی قوت تسخیر سے
گرچہ اک مٹی کے پیکر میں نہاں ہے زندگی

قلزم ہستی سے تو ابھرا ہے مانند حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی

خام ہے جب تک تو ہے مٹی کا اک انبار تو
پختہ ہو جائے تو ہے شمشیر بے زنہار تو

ہو صداقت کیلئے جس دل میں مرنے کی تڑپ
پہلے اپنے پیکر خاکی میں جاں پیدا کرے

پھونک ڈالے یہ زمین و آسمان مستعار
اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے

زندگی کی قوت پنہاں کو کر دے آشکار
تا یہ چنگاری فروغ جاوداں پیدا کرے

خاکِ مشرق پر چمک جائے مثالِ آفتاب
تا بدخشاں پھر وہی لعلِ گراں پیدا کرے

سوئے گردوں نالۂ شب گیر کا بھیجے سفیر
رات کے تاروں میں اپنے رازداں پیدا کرے

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے

سلطنت

آ بتاؤں تجھ کو رمز آیۂ انّ الملوک
سلطنت اقوامِ غالب کی ہے اک جادوگری

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر
پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری

جادوئے محمود کی تاثیر سے چشمِ ایاز
دیکھتی ہے حلقۂ گردن میں سازِ دلبری

خونِ اسرائیل آجاتا ہے آخر جوش میں
توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰ طلسمِ سامری

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آذری

از غلامی فطرتِ آزاد را رسوا مکن
تا تراشی خواجۂ از برہمن کافر تری

ہے وہی ساز کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

مجلسِ آئین و اصلاح و رعایات و حقوق
طب مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری

گرمیٔ گفتارِ اعضائے مجالس الاماں
یہ بھی اک سرمایہ داری کی ہے جنگ زرگری

اس سراب رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو
آہ اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

سرمایہ و محنت

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے
اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دار حیلہ گر!
دست دولت آفریں کو مزدیاں ملتی رہی
ساحر الموط نے تجھ کو دیا برگ حشیش
نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب رنگ
کٹ مرا ناداں خیالی دیوتاؤں کے لئے
مکر کی چالوں سے بازی لیگیا سرمایہ دار

خضر کا پیغام کیا ہے یہ پیام کائنات
شاخ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات!
اہل ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات
اور تو اے بے خبر سمجھا اسے شاخ نبات
خواجگی نے خوب چن چن کر بنائے مسکرات
سکر کی لذت میں تو لٹوا گیا نقد حیات
انتہائے سادگی میں کھا گیا مزدور مات

اٹھ کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

ہمت عالی تو دریا بھی نہیں کرتی قبول
نغمۂ بیداری جمہور ہے سامان عیش
آفتاب تازہ پیدا بطن گیتی سے ہوا

غنچہ ساں غافل ترے دامن میں شبنم کب تلک
قصہ خواب آور اسکندر و جم کب تلک
آسماں! ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک

توڑ ڈالیں فطرت انساں نے زنجیریں تمام
دوریٔ جنت سے روتی چشم آدم کب تلک

باغبانِ چارہ فرما سے یہ کہتی ہے بہار
زخم گل کے واسطے تدبیر مرہم کب تلک

کرمک ناداں طوافِ شمع سے آزاد ہو
اپنی فطرت کے تجلّی زار میں آباد ہو

دنیائے اسلام

کیا سناتا ہے مجھے ترک و عرب کی داستاں
مجھ سے کچھ پنہاں نہیں اسلامیوں کا سوز و ساز

لے گئے تثلیث کے فرزند میراث خلیل
خشت بنیاد کلیسا بن گئی خاک حجاز

ہو گئی رسوا زمانے میں کلاہ لالہ رنگ
جو سراپا ناز تھے ہیں آج مجبور نیاز

لے رہا ہے مے فروشانِ فرنگستان سے پارس
وہ مے سرکش حرارت جس کی ہے مینا گداز

حکمت مغرب سے ملت کی یہ کیفیت ہوئی
ٹکڑے ٹکڑے جس طرح سونے کو کر دیتا ہے گاز

ہو گیا مانندِ آب ارزاں مسلماں کا لہو
مضطرب ہے تو کہ تیرا دل نہیں دانائے راز

گفت رومی ہر بنائے کہنہ کآباداں کنند
می ندانی اوّل آں بنیاد را ویراں کنند

ملک ہاتھوں سے گیا ملت کی آنکھیں کھل گئیں
حق ترا چشمے عطا کر دست غافل در نگر

مومیائی کی گدائی سے تو بہتر ہے شکست
مور بے پر! حاجتے پیش سلیمانے مبر

ربط و ضبط ملت بیضا ہے مشرق کی نجات
ایشیا والے ہیں اس نکتے سے ابتک بے خبر

پھر سیاست چھوڑ کر داخل حصار دیں میں ہو
ملک و دولت ہے فقط حفظ حرم کا اک ثمر

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لیکر تابہ خاک کاشغر!

جو کرے گا امتیازِ رنگ و خوں مٹ جائے گا
ترک خرگاہی ہو یا اعرابئ والا گہر!

نسل اگر مسلم کی مذہب پہ مقدّم ہو گئی
اڑ گیا دنیا سے تو مانند خاک رہ گذر!

تا خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

اے کہ نشناسی خفی را از جلی ہشیار باش
اے گرفتار ابوبکر و علی ہشیار باش!

عشق کو فریاد لازم تھی سو وہ بھی ہو چکی
اب ذرا دل تھام کر فریاد کی تاثیر دیکھ

تو نے دیکھا سطوتِ رفتارِ دریا کا عروج
موج مضطر کس طرح بنتی ہے اب زنجیر دیکھ

عام حریت کا دیکھا تھا جو خواب اسلام نے
اے مسلماں آج تو اس خواب کی تعبیر دیکھ

اپنی خاکستر سمندر کو ہے سامانِ وجود
مر کے پھر ہوتا ہے پیدا یہ جہانِ پیر دیکھ

کھول کر آنکھیں مرے آئینہ گفتار میں
آنے والے دور کی دھندلی سی اِک تصویر دیکھ

آزمودہ فتنہ ہے اک اور بھی گردوں کے پاس
سامنے تقدیر کے رسوائی تدبیر دیکھ!

مسلم استی سینہ را از آرزو آباد دار
ہر زباں پیش نظر لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَادَ دار

طلوعِ اسلام

دلیلِ صبحِ روشن ہے ستاروں کی تنک تابی
افق سے آفتاب اُبھرا گیا دورِ گراں خوابی!

عروقِ مردۂ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا
سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی!

مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے
تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی!

عطا مومن کو پھر درگاہِ حق سے ہونیوالا ہے
شکوہ ترکمانی ذہن ہندی نطق اعرابی

اثر کچھ خواب کا غنچوں میں باقی ہے تو اے بلبل
"نوا را تلخ تر می زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی"

تڑپ صحن چمن میں آشیاں میں شاخساروں میں
جدا پارے سے ہو سکتی نہیں تقدیر سیمابی

وہ چشم پاک بیں کیوں زینتِ برگستواں دیکھے
نظر آتی ہے جس کو مردِ غازی کی جگر تابی!

ضمیرِ لالہ میں روشن چراغِ آرزو کر دے
چمن کے ذرے ذرے کو شہیدِ جستجو کر دے

سرشکِ چشمِ مسلم میں ہے نیساں کا اثر پیدا
خلیلؑ اللہ کے دریا میں ہوں گے پھر گہر پیدا

کتابِ ملتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا!

ربود آں ترکِ شیرازی دلِ تبریز و کابل را
صبا کرتی ہے بوئے گل سے اپنا ہمسفر پیدا

اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا!

جہانبانی سے ہے دشوار تر کارِ جہاں بینی
جگر خوں ہو تو چشمِ دل میں ہوتی ہے نظر پیدا!

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا!

نوا پیرا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنم سے
کبوتر کے تنِ نازک میں شاہیں کا جگر پیدا!

ترے سینے میں ہے پوشیدہ رازِ زندگی کہہ دے
مسلماں سے حدیثِ سوز و سازِ زندگی کہہ دے

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے

پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تو ہے!

مکاں فانی مکیں آنی ازل تیرا ابد تیرا
خدا کا آخری پیغام ہے تو جاوداں تو ہے!

خنابندِ عروسِ لالہ ہے خونِ جگر تیرا
تری نسبت براہیمی ہے معمارِ جہاں تو ہے!

تری فطرت امیں ہے ممکناتِ زندگانی کی
جہاں کے جوہرِ مضمر کا گویا امتحاں تو ہے!

جہانِ آب و گل سے عالمِ جاوید کی خاطر
نبوت ساتھ جس کو لے گئی وہ ارمغاں تو ہے!

یہ نکتہ سرگذشتِ ملتِ بیضا سے ہے پیدا
کہ اقوامِ زمینِ ایشیا کا پاسباں تو ہے

سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا!

یہی مقصودِ فطرت ہے یہی رمزِ مسلمانی
اخوت کی جہانگیری محبت کی فراوانی!

بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی!

میانِ شاخساراں صحبتِ مرغِ چمن کب تک
ترے بازو میں ہے پروازِ شاہینِ قہستانی!

گماں آبادِ ہستی میں یقیں مردِ مسلماں کا
بیاباں کی شبِ تاریک میں قندیلِ رہبانی!

مٹایا قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جس نے
وہ کیا تھا؟ زورِ حیدر فقرِ بوذر صدقِ سلمانی!

ہوئے احرارِ ملت جادہ پیما کس تجمل سے
تماشائی شگافِ در سے ہیں صدیوں کے زندانی!

ثباتِ زندگی ایمانِ محکم سے ہے دنیا میں
کہ الوانی سے بھی پائندہ تر نکلا ہے تورانی!

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ روح الامیں پیدا

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا،
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
ولایت، پادشاہی، علم اشیا کی جہانگیری
یہ سب کیا ہیں؟ فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں!
براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنا لیتی ہے تصویریں!
تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیت ہے
حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں!
حقیقت ایک ہے ہر شے کی خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرہ کا دل چیریں
یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

چہ باید مرد را طبعِ بلندے مشربِ نابے
دلِ گرمے نگاہِ پاک بینے جانِ بیتابے!

عقابی شان سے جھپٹے تھے جو بے بال و پر نکلے
ستارے شام کے خونِ شفق میں ڈوب کر نکلے!
ہوئے مدفونِ دریا زیرِ دریا تیرنے والے
طمانچے موج کے کھاتے تھے جو، بن کر گہر نکلے!
غبارِ رہگذر ہیں، کیمیا پر ناز تھا جن کو
جبینیں خاک پر رکھتے تھے جو اکسیر گر نکلے!
ہمارا نرم رو قاصد پیامِ زندگی لایا
خبر دیتی تھیں جن کو بجلیاں وہ بے خبر نکلے!
حرم رسوا ہوا پیرِ حرم کی کم نگاہی سے
جوانانِ تتاری کس قدر صاحب نظر نکلے!
زمیں سے نوریانِ آسماں پرواز کہتے تھے
یہ خاکی زندہ تر پائندہ تر تابندہ تر نکلے!
جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے!

یقیں افراد کا سرمایۂ تعمیرِ ملت ہے
یہی قوت ہے جو صورت گرِ تقدیرِ ملت ہے

تو رازِ کن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا
خودی کا رازداں ہو جا خدا کا ترجماں ہو جا

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو
اخوت کا بیاں ہو جا محبت کی زباں ہو جا

یہ ہندی وہ خراسانی یہ افغانی وہ تورانی
تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بیکراں ہو جا

غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تو اے مرغِ حرم اڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا

خودی میں ڈوب جا غافل یہ سرِ زندگانی ہے
نکل کر حلقۂ شام و سحر سے جاوداں ہو جا

مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر
شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا

گذر جا بن کے سیلِ تند رو کوہ و بیاباں سے
گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

ترے علم و محبت کی نہیں ہے انتہا کوئی
نہیں ہے تجھ سے بڑھ کر سازِ فطرت میں نوا کوئی!

ابھی تک آدمی صیدِ زبونِ شہریاری ہے
قیامت ہے کہ انساں نوعِ انساں کا شکاری ہے!

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے!

وہ حکمت ناز تھا جس پر خردمندانِ مغرب کو
ہوس کے پنجۂ خونیں میں تیغِ کارزاری ہے!

تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

خروش آموزِ بلبل ہو گرہ غنچے کی وا کر دے
کہ تو اس گلستاں کے واسطے بادِ بہاری ہے

پھر اٹھی ایشیا کے دل سے چنگاری محبت کی
زمیں جولانگہِ اطلس قبایانِ تتاری ہے!

بیا پیدا خریدار است جانِ ناتوانے را
"پس از مدت گذار افتاد بر ما کاروانے را"

بیا ساقی نوائے مرغ زار از شاخسار آمد
بہار آمد نگار آمد نگار آمد قرار آمد!

کشید ابرِ بہاری خیمہ اندر وادی و صحرا
صدائے آبشاراں از فرازِ کوہسار آمد!

سرت گردم تو ہم قانونِ پیشیں ساز دہ ساقی
کہ خیلِ نغمہ پرداز اں قطار اندر قطار آمد!

کنار از زاہداں برگیر و بیباکانہ ساغر کش
پس از مدت ازیں شاخِ کہن بانگِ ہزار آمد!

بہ مشتاقاں حدیثِ خواجۂ بدر و حنین آور
تصرف ہائے پنہانش بچشمم آشکار آمد!

دگر شاخِ خلیلؑ از خونِ ما نمناک میگردد
ببازارِ محبت نقدِ ما کامل عیار آمد!

سرِ خاکِ شہیدے برگہائے لالہ می پاشم
کہ خونش با نہالِ ملتِ ما سازگار آمد!

بیا تا گل بیفشانیم مے در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشگافیم و طرحِ دیگر اندازیم

مسجدِ قرطبہ

(ہسپانیہ کی سرزمین بالخصوص قرطبہ میں لکھی گئی)

سلسلۂ روز و شب نقش گرِ حادثات
سلسلۂ روز و شب اصل حیات و ممات
سلسلۂ روز و شب تارِ حریرِ دو رنگ
جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات
سلسلۂ روز و شب ساز ازل کی فغاں
جس سے دکھاتی ہے ذات زیر و بمِ ممکنات
تجھ کو پرکھتا ہے یہ، مجھ کو پرکھتا ہے یہ
سلسلۂ روز و شب صیرفیِ کائنات!
تو ہو اگر کم عیار میں ہوں اگر کم عیار
موت ہے تیری برات، موت ہے میری برات
تیرے شب و روز کی اور حقیقت ہے کیا
ایک زمانے کی رَو جس میں نہ دن ہے نہ رات!
آئی و فانی تمام معجزہ ہائے ہُنر
کارِ جہاں بے ثبات، کارِ جہاں بے ثبات

اوّل و آخر فنا باطن و ظاہر فنا
نقشِ کہن ہو کہ نو منزلِ آخر فنا

ہے مگر اُس نقش میں رنگِ ثباتِ دوام
جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام
مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصلِ حیات موت ہے اس پر حرام
تند و سُبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رو
عشق خود اک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام
عشق کی تقویم میں عصرِ رواں کے سوا
اور زمانے بھی ہیں، جن کا نہیں کوئی نام!
عشق دمِ جبرئیل، عشق دلِ مصطفےٰ!
عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام!
عشق کی مستی سے ہے پیکرِ گل تابناک
عشق ہے صہبائے خام عشق ہے کاس الکرام
عشق فقیہہِ حرم عشق امیرِ جنود!
عشق ہے ابن السبیل اسکے ہزاروں مقام

عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات
عشق سے نورِ حیات عشق سے نارِ حیات

اے حرمِ قرطبہ! عشق سے تیرا وجود
عشق سراپا دوام جس میں نہیں رفت و بود
رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود!
قطرۂ خونِ جگر سِل کو بناتا ہے دل
خونِ جگر سے صدا سوز و سرور و سرود!
تیری فضا دل فروز میری نوا سینہ سوز
تجھ سے دلوں کا حضور مجھ سے دلوں کی کشود!
عرشِ مُعلّٰے سے کم سینۂ آدم نہیں
گرچہ کفِ خاک کی حد ہے سپہرِ کبود!
پیکرِ نوری کو ہے سجدہ میسّر تو کیا
اس کو میسّر نہیں سوز و گدازِ سجود!
کافرِ ہندی ہوں میں دیکھ مرا ذوق و شوق
دل میں صلوٰۃ و درود لب پہ صلوٰۃ و درود!

شوق مری لے میں ہے، شوق مری نے میں ہے
نغمہ اللہ ھُو میرے رگ و پے میں ہے

تیرا جلال و جمال مردِ خدا کی دلیل!
وہ بھی جلیل و جمیل تو بھی جلیل و جمیل!
تیری بنا پائیدار تیرے ستوں بے شمار

شام کے صحرا میں ہو جیسے ہجوم نخیل!
تیرے در و بام پر وادیٔ ایمن کا نور
تیرا منار بلند جلوہ گہِ جبرئیل
مٹ نہیں سکتا کبھی مردِ مسلماں کہ ہے
اس کی اذانوں سے فاش سرِّ کلیم و خلیل
اس کی زمین بے حدود اس کا افق بے ثغور
اس کے سمندر کی موج دجلہ و دنیوب و نیل
اس کے زمانے عجیب اسکے فسانے غریب
عہدِ کہن کو دیا اس نے پیامِ رحیل
ساقیٔ ارباب ذوق، فارس میدانِ شوق
بادہ ہے اس کا رحیق تیغ ہے اسکی اصیل
مردِ سپاہی ہے وہ اس کی زرہ لَا اِلٰہ
سایۂ شمشیر میں اس کی پنہ لَا اِلٰہ
تجھ سے ہوا آشکار بندۂ مومن کا راز
اس کے دنوں کی تپش اسکی شبوں کا گداز
اس کا مقام بلند اس کا خیال عظیم
اس کا سرور اسکا شوق اسکا نیاز اسکا ناز
ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں کارکشا کارساز

خاکی و نوری نہاد بندۂ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی اس کا دلِ بے نیاز
اس کی امیدیں قلیل اسکے مقاصد جلیل
اس کی ادا دلفریب اسکی نگہ دل نواز
نرم دمِ گفتگو گرم دمِ جستجو!
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز
نقطۂ پرکارِ حق سرِّ خدا کا یقین
اور یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز

عشق کی منزل ہے وہ، عشق کا حاصل ہے وہ
حلقۂ آفاق میں گرمیٔ محفل ہے وہ
کعبۂ ارباب فن! اسطوتِ دینِ مبیں
تجھ سے حرم مرتبت اندلسیوں کی زمیں
ہے تہ گردوں اگر حسن میں تیری نظیر
قلبِ مسلماں میں ہے اور نہیں ہے کہیں
آہ وہ مردانِ حق! وہ عربی شہسوار
حاملِ "خلقِ عظیم" صاحبِ صدق و یقیں
جن کی حکومت سے ہے فاش یہ رمزِ غریب
سلطنتِ اہلِ دل فقر ہے شاہی نہیں
جن کی نگاہوں نے کی تربیتِ شرق و غرب

ظلمتِ یوروپ میں تھی جن کی خرد راہ نما
جن کے لہو کی طفیل آج بھی ہیں اندلسی
خوش دل و گرم اختلاط سادہ و روشن جبیں
آج بھی اس دیس میں عام ہے چشم غزال
اور نگاہوں کے تیر آج بھی ہیں دل نشیں!

بوئے یمن آج بھی اس کی ہواؤں میں ہے
رنگِ حجاز آج بھی اس کی نواؤں میں ہے
دیدۂ انجم میں ہے تیری زمیں آسماں
آہ کہ صدیوں سے ہے تیری فضا بے اذاں
کون سی وادی میں ہے، کونسی منزل میں ہے
عشقِ بلا خیز کا قافلۂ سخت جاں
دیکھ چکا المنی شورشِ اصلاحِ دیں
جس نے نہ چھوڑے کہیں نقشِ کہن کے نشاں!
حرفِ غلط بن گئی عصمتِ پیرِ کنشت
اور ہوئی فکر کی کشتی نازک رواں!
چشمِ فرانسیس بھی دیکھ چکی انقلاب
جس سے دگرگوں ہوا مغربیوں کا جہاں
ملّتِ رومی نژاد کہنہ پرستی سے پیر
لذّتِ تجدید سے وہ بچی ہوئی پھر جواں!

رُوحِ مسلماں میں ہے آج وہی اضطراب
رازِ خدائی ہے یہ کہہ نہیں سکتی زباں
دیکھئے اس بحر کی تہہ سے اُچھلتا ہے کیا
گنبدِ نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا
وادی کہسار میں غرقِ شفق ہے سحاب
لعلِ بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا آفتاب
سادہ و پُرسوز ہے دُخترِ دہقاں کا گیت
کشتیِ دل کے لئے سیل ہے عہدِ شباب
آبِ روانِ کبیر! تیرے کنارے کوئی
دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب
عالمِ نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں
میری نگاہوں میں ہے اسکی سحر بے حجاب
پردہ اٹھا دوں اگر چہرۂ افکار سے
لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب
جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی
رُوحِ اُمم کی حیات کشمکشِ انقلاب
صورتِ شمشیر ہے دست قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب
نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر!
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر!

طارق کی دُعا

یہ غازی یہ تیرے پراسرار بندے — جنھیں تو نے بخشا ہے ذوقِ خدائی
دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا — سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی
دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو — عجب چیز ہے لذتِ آشنائی
شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن — نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی

نیاباں میں ہے منتظر لالہ کب سے
قبا چاہیئے اس کو خونِ عرب سے

کیا تو نے صحرا نشینوں کو یکتا — خبر میں، نظر میں اذانِ سحر میں
طلب جس کی صدیوں سے تھی زندگی کو — وہ سوز اس نے پایا انھیں کے جگر میں
کشادِ درِ دل سمجھتے ہیں اس کو — ہلاکت نہیں موت ان کی نظر میں
دلِ مردِ مومن میں پھر زندہ کر دے — وہ بجلی کہ تھی نعرۂ لاتذر میں

عزائم کو سینوں میں بیدار کر دے
نگاہِ مسلماں کو تلوار کر دے

ذوق و شوق

قلب و نظر کی زندگی دشت میں صبح کا سماں
چشمۂ آفتاب سے نور کی ندیاں رواں
حسنِ ازل کی ہے نمود چاک ہے پردۂ وجود
دل کے لئے ہزار سود، ایک نگاہ کا زیاں
سرخ و کبود بدلیاں چھوڑ گیا سحابِ شب
کوہِ اضم کو دے گیا رنگ بہ رنگ طیلساں
گرد سے پاک ہے ہوا برگ نخیل دُھل گئے
ریگ نواحِ کاظمہ نرم ہے مثلِ پرنیاں
آگ بجھی ہوئی اِدھر، ٹوٹی ہوئی طناب اُدھر
کیا خبر اس مقام سے گزرے ہیں کتنے کارواں
آئی صدائے جبرئیل تیرا مقام ہے یہی
اہلِ فراق کے لئے عیش و دوام ہے یہی
کس سے کہوں کہ زہر ہے میرے لئے مئے حیات
کہنہ بزمِ کائنات، تازہ ہیں میرے واردات

کیا نہیں اور غزنوی کارگہ حیات میں
بیٹھے ہیں کب سے منتظر اہل حرم کے سومنات

ذکرِ عرب کے سوز میں فکرِ عجم کے ساز میں
نے عربی مشاہدات نے عجمی تخیلات

قافلۂ حجاز میں ایک حسین بھی نہیں
گرچہ ہے تاب دار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات

عقل و دل و نگاہ کا مرشد اولیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بت کدۂ تصورات

صدقِ خلیل بھی ہے عشق صبرِ حسین بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

آیۂ کائنات کا معنیٔ دیریاب تو
نکلے تری تلاش میں قافلہ ہائے رنگ و بو

جلوتیانِ مدرسہ کور نگاہ و مردہ ذوق
خلوتیانِ میکدہ کم طلب و تہی کدو

میں کہ مری غزل میں ہے آتش رفتہ کا سراغ
میری تمام سرگذشت کھوئے ہوؤں کی جستجو

کیا نہیں اور غزنوی کارگہِ حیات میں
بیٹھے ہیں کب سے منتظر اہلِ حرم کے سومنات

ذکرِ عرب کے سوز میں فکرِ عجم کے ساز میں
نے عربی مشاہدات نے عجمی تخیلات

قافلۂ حجاز میں ایک حسین بھی نہیں
گرچہ ہے تاب دار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات

عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اولیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بت کدۂ تصورات

صدقِ خلیل بھی ہے عشق صبرِ حسین بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

آیۂ کائنات کا معنیٔ دیریاب تو
نکلے تری تلاش میں قافلہ ہائے رنگ و بو

جلوتیانِ مدرسہ کور نگاہ و مردہ ذوق
خلوتیانِ میکدہ کم طلب و تہی کدو

میں کہ مری غزل میں ہے آتشِ رفتہ کا سراغ
میری تمام سرگذشت کھوئے ہوؤں کی جستجو

بادِ صبا کی موج سے نشو و نمائے خار و خس
میرے نفس کی موج سے نشو و نمائے آرزو

خونِ دل و جگر سے ہے میری نوا کی پرورش
ہے رگِ ساز میں رواں صاحبِ ساز کا لہو

فرصتِ کشمکش مدہ ایں دلِ بے قرار را
یک دو شکن زیادہ کن گیسوئے تاب دار را

لوح بھی تو قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب
گنبدِ آب گینہ رنگ تیرے محیط میں حباب

عالمِ آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ
ذرّہ ریگ کو دیا تو نے طلوعِ آفتاب

شوکتِ سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود
فقرِ جنید و بایزید تیرا جمالِ بے نقاب

شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب! میرا سجود بھی حجاب

تیری نگاہِ ناز سے دونوں مراد پا گئے
عقلِ غیاب و جستجو! عشق حضور و اضطراب

تیرہ و تار ہے جہانِ گردشِ آفتاب سے
صبحِ زمانہ تازہ کر جلوۂ بے حجاب سے

تیری نظر میں ہیں تمام میرے گذشتہ روز و شب
مجھ کو خبر نہ تھی کہ ہے علم تخیلِ بے رطب

تازہ مرے ضمیر میں معرکۂ کہن ہوا
عشق تمام مصطفےٰ! عقل تمام بولہب

گاہِ بہ حیلہ می برد، گاہِ بہ زور می کشد
عشق کی ابتدا عجب! عشق کی انتہا عجب

عالمِ سوز و ساز میں وصل سے بڑھ کے ہے فراق
وصل میں مرگِ آرزو! ہجر میں لذتِ طلب

عینِ وصال میں مجھے حوصلۂ نظر نہ تھا
گرچہ بہانہ جو رہی میری نگاہ بے ادب

گرمیِ آرزو فراق! شورشِ ہائے و ہو فراق!
موج کی جستجو فراق! قطرہ کی آبرو فراق!

ساقی نامہ

ہوا خیمہ زن کاروان بہار
ارم بن گیا دامنِ کوہسار

گل و نرگس و سوسن و نسترن
شہیدِ ازل لالہ خونیں کفن

جہاں چھپ گیا پردۂ رنگ میں
لہو کی ہے گردش رگِ سنگ میں

فضا نیلی نیلی ہوا میں سُرور
ٹھہرتے نہیں آشیاں میں طیور

وہ جوئے کہستاں اچکتی ہوئی
اٹکتی لچکتی سرکتی ہوئی

اچھلتی پھسلتی سنبھلتی ہوئی
بڑے پیچ کھا کر نکلتی ہوئی

رُکے جب تو سِل چیر دیتی ہے یہ
پہاڑوں کے دل چیر دیتی ہے یہ

ذرا دیکھ اے ساقیٔ لالہ فام
سناتی ہے یہ زندگی کا پیام

پلا دے مجھے وہ مئے پردہ سوز
کہ آتی نہیں فصلِ گل روز روز

وہ مئے جس سے روشن ضمیرِ حیات
وہ مئے جس سے ہے مستیٔ کائنات

وہ مئے جس میں ہے سوزِ سازِ ازل
وہ مئے جس سے کھلتا ہے رازِ ازل

اٹھا ساقیا پردہ اس راز سے
لڑا دے ممولے کو شہباز سے

زمانے کے انداز بدلے گئے
نیا راگ ہے ساز بدلے گئے

ہوا اس طرح فاش رازِ فرنگ
کہ حیرت میں ہے شیشہ بازِ فرنگ

پرانی سیاست گری خوار ہے
زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے

گیا دورِ سرمایہ داری گیا
تماشا دکھا کر مداری گیا

گراں خواب چینی سنبھلنے لگے
ہمالہ کے چشمے ابلنے لگے

دلِ طورِ سینا و فاراں دو نیم
تجلّی کا پھر منتظر ہے کلیم!

مسلماں ہے توحید میں گرم جوش
مگر دل ابھی تک ہے زنّار پوش

تمدّن تصوّف شریعت کلام
بتانِ عجم کے پجاری تمام

حقیقت خرافات میں کھو گئی
یہ اُمّت روایات میں کھو گئی

لبھاتا ہے دل کو کلامِ خطیب
مگر لذّتِ شوق سے بے نصیب

بیاں اس کا منطق سے سلجھا ہوا
لُغت کے بکھیڑوں میں الجھا ہوا

وہ صوفی کہ تھا خدمتِ حق میں مرد
محبت میں یکتا حمیّت میں فرد

عجم کے خیالات میں کھو گیا
یہ سالک مقامات میں کھو گیا

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

شرابِ کہن پھر پلا ساقیا
وہی جام گردش میں لا ساقیا

مجھے عشق کے پر لگا کر اُڑا
مری خاک جگنو بنا کر اُڑا

خرد کو غلامی سے آزاد کر
جوانوں کو پیروں کا استاد کر

ہری شاخِ ملّت ترے نم سے ہے
نفس اس بدن میں ترے دم سے ہے

تڑپنے پھڑکنے کی توفیق دے   دلِ مرتضےٰ سوزِ صدیق دے
جگر سے وہی تیر پھر پار کر   تمنا کو سینے میں بیدار کر
ترے آسمانوں کے تاروں کی خیر   زمینوں کے شب زندہ داروں کی خیر
جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے   مرا عشق میری نظر بخش دے
مری ناؤ گرداب سے پار کر   یہ ثابت ہے تو اس کو سیار کر
بتا مجھ کو اسرار مرگِ حیات   کہ تیری نگاہوں میں ہے کائنات
مری دیدۂ تر کی بے خوابیاں   مرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں
مرے نالۂ نیم شب کا نیاز   مری خلوت انجمن کا گداز
امنگیں مری آرزوئیں مری   امیدیں مری جستجوئیں مری
مری فطرت آئینۂ روزگار   غزالانِ افکار کا مرغزار
مرا دل مری رزم گاہِ حیات   گمانوں کے لشکر یقیں کا ثبات
یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر   اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر

مرے قافلے میں لٹا دے اُسے
لٹا دے ٹھکانے لگا دے اُسے

دما دم رواں ہے یمِ زندگی   ہر اک شے میں پیدا رمِ زندگی
اسی سے ہوئی ہے بدن کی نمود   کہ شعلوں میں پوشیدہ ہے موجِ دود
گراں گرچہ ہے صحبتِ آب و گل   خوش آئی اسے محنتِ آب و گل

یہ ثابت بھی ہے اور سیّار بھی
عناصر کے پھندوں سے بیزار بھی

یہ وحدت ہے کثرت میں ہر دم اسیر
مگر ہر کہیں بے چگوں بے نظیر

یہ عالم یہ بت خانہ شش جہات
اسی نے تراشا ہے یہ سومنات

پسند اس کو تکرار کی خو نہیں
کہ تو میں نہیں اور میں تو نہیں

من و تو سے ہے انجمن آفریں
مگر عین محفل میں خلوت نشیں

چمک اس کی بجلی میں تارے میں ہے
یہ چاندی میں سونے میں پارے میں ہے

اسی کے بیاباں اسی کے ببول
اسی کے ہیں کانٹے اسی کے ہیں پھول

کہیں اسکی طاقت سے کہسار چور
کہیں اسکے پھندے میں جبریل حور

کہیں جرّہ شاہین سیماب رنگ
لہو سے چکوروں کے آلودہ چنگ

کبوتر کہیں آشیانے سے دور
پھڑکتا ہوا جال میں ناصبور

فریب نظر ہے سکون و ثبات
تڑپتا ہے ہر ذرۂ کائنات

ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود
کہ ہر لحظہ ہے تازہ شان وجود

سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی
فقط ذوق پرواز ہے زندگی

بہت اس نے دیکھے ہیں پست و بلند
سفر اس کو منزل سے بڑھکر پسند

سفر زندگی کے لئے برگ و ساز
سفر ہے حقیقت حضر ہے مجاز

الجھ کر سلجھنے میں لذّت اُسے
تڑپنے پھڑکنے میں راحت اُسے

ہوا جب اسے سامنا موت کا — کٹھن تھا بڑا تھامنا موت کا
اتر کر جہانِ مکافات میں — رہی زندگی موت کی گھات میں
مذاق دوئی سے بنی زوج زوج — اٹھی دشت کہسار سے فوج فوج
گل اس شاخ سے ٹوٹتے بھی رہے — اسی شاخ سے پھوٹتے بھی رہے
سمجھتے ہیں ناداں اسے بے ثبات — ابھرتا ہے مٹ مٹ کے نقشِ حیات
بڑی تیز جولاں بڑی زود رس — ازل سے ابد تک رمِ یک نفس

زمانہ کہ زنجیرِ ایّام ہے
دموں کے اُلٹ پھیر کا نام ہے

یہ موجِ نفس کیا ہے تلوار ہے — خودی کیا ہے تلوار کی دھار ہے
خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات — خودی کیا ہے بیداریٔ کائنات
خودی جلوہ بدمست و خلوت پسند — سمندر ہے اک بوند پانی میں بند
اندھیرے اجالے میں ہے تابناک — من و تو میں پیدا من و تو سے پاک
ازل اس کے پیچھے ابد سامنے — نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے
زمانے کے دریا میں بہتی ہوئی — دمادم نگاہیں بدلتی ہوئی
سبک اس کے ہاتھوں میں سنگِ گراں — پہاڑ اسکی ضربوں سے ریگِ رواں
سفر اس کا انجام و آغاز ہے — یہی اس کی تقویم کا راز ہے
کرن چاند میں ہے شرر رنگ میں — یہ بے رنگ ہے ڈوب کر رنگ میں

اُسے واسطہ کیا کم و بیش سے — نشیب و فراز و پس و پیش سے
ازل سے ہے یہ کشمکش میں اسیر — ہوئی خاک آدم میں صورت پذیر

خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے
فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے

خودی کے نگہباں کو ہے زہر ناب — وہ ناں جس سے جاتی رہے اسکی آب
وہی ناں ہے اس کیلئے ارجمند — رہے جس سے دنیا میں گردن بلند
فروغالِ محمود سے در گزر — خودی کو نگہ رکھ ایازی نہ کر
وہی سجدہ ہے لائق اہتمام — کہ ہو جس سے ہر سجدہ تجھ پر حرام
یہ عالم یہ ہنگامۂ رنگ و صورت — یہ عالم کہ ہے زیر فرمان موت
یہ عالم یہ بت خانۂ چشم و گوش — جہاں زندگی ہے فقط خورد و نوش
خودی کی یہ ہے منزلِ اوّلیں — مسافر! یہ تیرا نشیمن نہیں
تری آگ اس خاکداں سے نہیں — جہاں تجھ سے ہے تو جہاں سے نہیں
بڑھے جا یہ کوہِ گراں توڑ کر — طلسمِ زمان و مکاں توڑ کر
خودی شیر مولا جہاں اس کا صید — زمیں اسکی صید آسماں اسکا صید
جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود — کہ خالی نہیں ہے ضمیر وجود
ہزاک منتظر تیری یلغار کا — تری شوخیٔ فکر و کردار کا
یہ ہے مقصدِ گردشِ روزگار — کہ تیری خودی تجھ پہ ہو آشکار

تو ہے فاتحِ عالمِ خوب و زشت   تجھے کیا بتاؤں تری سرنوشت

حقیقت پہ ہے جامۂ حرف تنگ   حقیقت ہے آئینہ گفتار زنگ

فروزاں ہے سینے میں شمعِ نفس   مگر تابِ گفتار کہتی ہے بس

اگر یک سرِ موئے برتر پرم   فروغِ تجلّٰے بسوزد پرم

شعاعِ امّید

(۱) سورج نے دیا اپنی شعاعوں کو یہ پیغام
دنیا ہے عجب چیز! کبھی صبح کبھی شام
مدت سے تم آوارہ ہو پہنائے فضا میں
بڑھتی ہی چلی جاتی ہے بے مہریٔ ایام
نے ریت کے ذرّوں پہ چمکنے میں ہے راحت
نے مثلِ صبا طوفِ گل و لالہ میں آرام
پھر میرے تجلّی کدۂ دل میں سما جاؤ
چھوڑو چمنستان و بیابان و در و بام

(۲) آفاق کے ہر گوشہ سے اٹھتی ہیں شعاعیں
بچھڑے ہوئے خورشید سے ہوتی ہیں ہم آغوش
اک شور ہے مغرب میں اُجالا نہیں ممکن
افرنگ مشینوں کے دھوئیں سے ہے سیہ پوش
مشرق نہیں گو لذّتِ نظّارہ سے محروم
لیکن صفتِ عالمِ لاہوت ہے خاموش

پھر ہم کو اسی سینۂ روشن میں چھپا لے
اے مہرِ جہاں تاب نہ کر ہم کو فراموش

(۳) اک شوخ کرن، شوخ مثالِ نگہِ حور
آرام سے فارغ صفتِ جوہرِ سیماب
بولی کہ مجھے رخصتِ تنویر عطا ہو
جب تک نہ ہو مشرق کا ہر اک ذرّہ جہاں تاب
چھوڑوں گی نہ میں ہند کی تاریک فضا کو
جب تک نہ اٹھیں خواب سے مردانِ گراں خواب
خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز
اقبال کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب
چشمِ مہ و پرویں ہے اسی خاک سے روشن
یہ خاک کہ ہے جس کا خزف ریزہ دُرِ ناب!
اس خاک سے اٹھے ہیں وہ غوّاصِ معانی
جن کے لئے ہر بحرِ پُر آشوب ہے پایاب
جس ساز کے نغموں سے حرارت تھی دلوں میں
محفل کا وہی ساز ہے بیگانۂ مضراب
بت خانے کے دروازہ پہ سوتا ہے برہمن
تقدیر کو روتا ہے مسلماں تہِ محراب
مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

ابلیس کی مجلسِ شوریٰ

ابلیس

یہ عناصر کا پرانا کھیل! یہ دنیائے دوں!
ساکنانِ عرشِ اعظم کی تمناؤں کا خوں!

اس کی بربادی پہ آج آمادہ ہے وہ کارساز
جس نے اس کا نام رکھا تھا جہانِ کاف و نوں

میں نے دکھلایا فرنگی کو ملوکیت کا خواب
میں نے توڑا مسجد و دیر و کلیسا کا فسوں

میں نے ناداروں کو سکھلایا سبق تقدیر کا
میں نے منعم کو دیا سرمایہ داری کا جنوں!

کون کر سکتا ہے اس کی آتشِ سوزاں کو سرد
جس کے ہنگاموں میں ہو ابلیس کا سوزِ دروں

جس کی شاخیں ہوں ہماری آبیاری سے بلند
کون کر سکتا ہے اس نخلِ کہن کو سرنگوں؟

پہلا مشیر

اس میں کیا شک ہے کہ محکم ہے یہ ابلیسی نظام
پختہ تر اس سے ہوئے خوئے غلامی میں عوام

ہے ازل سے ان غریبوں کے مقدر میں سجود
ان کی فطرت کا تقاضا ہے نمازِ بے قیام

آرزو اوّل تو پیدا ہو نہیں سکتی کہیں
ہو کہیں پیدا تو مر جاتی ہے یا رہتی ہے خام!

یہ ہماری سعیِ پیہم کی کرامت ہے کہ آج
صوفی و مُلّا ملوکیت کے بندے ہیں تمام!

طبعِ مشرق کے لئے موزوں یہی افیون تھی
ورنہ 'قوالی' سے کچھ کمتر نہیں 'علم کلام'

ہے طواف و حج کا ہنگامہ اگر باقی تو کیا
کُند ہو کر رہ گئی مومن کی تیغِ بے نیام!

کس کی نومیدی پہ حجت ہے، یہ فرمانِ جدید!
ہے جہاد اس دور میں مردِ مسلماں پر حرام!"

دوسرا مبشّر

خیر ہے سلطانیٔ جمہور کا غوغا کہ شر؟
تو جہاں کے تازہ فتنوں سے نہیں ہے باخبر!

پہلا مبشّر

ہوں، مگر میری جہاں بینی بتاتی ہے مجھے
جو ملوکیت کا اک پردہ ہو کیا اس سے خطر
ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس
جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خود نگر
کاروبارِ شہریاری کی حقیقت اور ہے
یہ وجودِ 'میر و سلطاں' پر نہیں ہے منحصر
مجلسِ ملّت ہو یا پرویز کا دربار ہو
ہے وہ سلطاں غیر کی کھیتی پہ ہو جس کی نظر!
تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام؟
چہرہ روشن، اندروں چنگیز سے تاریک تر!

تیسرا مبشّر

رُوحِ سلطانی رہے باقی تو پھر کیا اضطراب
ہے مگر کیا اس یہودی کی شرارت کا جواب؟
وہ کلیمِ بے تجلی! وہ مسیحِ بے صلیب!
نیست پیغمبر و لیکن در بغل دارد کتاب!
کیا بتاؤں کیا ہے کافر کی نگاہِ پردہ سوز
مشرق و مغرب کی قوموں کیلئے روزِ حساب!
اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا طبیعت کا فساد
توڑ دی بندوں نے آقاؤں کے خیموں کی طناب!

چوتھا مبشر

توڑ اس کا رومۃ الکبریٰ کے ایوانوں میں دیکھ
آلِ سیزر کو دکھایا ہم نے پھر سیزر کا خواب

کون بحرِ روم کی موجوں سے ہے لپٹا ہوا
گاہِ بالد چوں صنوبر گاہِ نالد چوں رباب!

تیسرا مبشر

میں تو اس کی عاقبت بینی کا کچھ قائل نہیں
جس نے افرنگی سیاست کو کیا یوں بے حجاب!

پانچواں مبشر

(ابلیس کو مخاطب کر کے)

اے ترے سوزِ نفس سے کارِ عالم استوار
تو نے جب چاہا کیا ہر پردگی کو آشکار

آب و گل تیری حرارت سے جہانِ سوز و ساز
ابلہِ جنت تری تعلیم سے دانائے کار

تجھ سے بڑھ کر فطرتِ آدم کا وہ محرم نہیں
سادہ دل بندوں میں جو مشہور ہے پروردگار

کام تھا جن کا فقط تقدیس و تسبیح و طواف
تیری غیرت سے ابد تک سرنگوں و شرمسار

گرچہ ہیں تیرے مرید افرنگ کے ساحر تمام
اب مجھے ان کی فراست پر نہیں ہے اعتبار

وہ یہودی فتنہ گر وہ روحِ مزدک کا بُرادر
ہر قبا ہونے کو ہے اس کے جنوں سے تار تار

زاغِ دشتی ہو رہا ہے ہمسرِ شاہین و چرغ
کتنی سرعت سے بدلتا ہے مزاجِ روزگار

چھا گئی آشفتہ ہو کر وسعتِ افلاک پر
جس کو نادانی سے ہم سمجھے تھے اک مشتِ غبار

فتنۂ فردا کی ہیبت کا یہ عالم ہے کہ آج
کانپتے ہیں کوہسار و مرغزار و جوئبار

میرے آقا! وہ جہاں زیر و زبر ہونے کو ہے
جس جہاں کا ہے فقط تیری سیادت پر مدار

ابلیس

(اپنے مشیروں سے)

ہے مرے دستِ تصرف میں جہانِ رنگ و بو
کیا زمیں کیا مہر و مہ کیا آسمانِ نیلگوں
دیکھ لیں گے اپنی آنکھوں سے تماشا غرب و شرق
میں نے جب گرما دیا اقوامِ یورپ کا لہو
کیا امامانِ سیاست، کیا کلیسا کے شیوخ
سب کو دیوانہ بنا سکتی ہے میری ایک ہو!
کارگاہِ شیشہ جو ناداں سمجھتا ہے اسے
توڑ کر دیکھے تو اس تہذیب کے جام و سبو
دستِ فطرت نے کیا ہے جن گریبانوں کو چاک
مزدکی منطق کی سوزن سے نہیں ہوتے رفو
کب ڈرا سکتے ہیں مجھ کو اشتراکی کوچہ گرد
یہ پریشاں روزگار، آشفتہ مغز، آشفتہ مو
ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس امت سے ہے
جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو
خال خال اس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ
کرتے ہیں اشک سحر گاہی سے جو ظالم وضو

جانتا ہے، جس پہ روشن باطنِ ایام ہے
مزدکیت فتنۂ فردا نہیں، اسلام ہے

(۲)

جانتا ہوں میں یہ امت حاملِ قرآں نہیں
ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں
جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں
بے یدِ بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں
عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں
الحذر آئینِ پیغمبرؐ سے سو بار الحذر
حافظِ ناموسِ زن، مرد آزما، مرد آفریں

موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے
نے کوئی فغفور و خاقاں، نے فقیرِ رہ نشیں

کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک و صاف
منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب!
پادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں

چشمِ عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب
یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محرومِ یقیں!

ہے یہی بہتر الٰہیات میں اُلجھا ہے
یہ کتابِ اللہ کی تاویلات میں اُلجھا ہے

(۳)

توڑ ڈالیں جس کی تکبیریں طلسمِ شش جہات
ہو نہ روشن اس خدا اندیش کی تاریک رات!

ابنِ مریم مر گیا یا زندۂ جاوید ہے؟
ہیں صفاتِ ذاتِ حق، حق سے جدا یا عینِ ذات؟

آنے والے سے مسیحِ ناصری مقصود ہے
یا مجدد جس میں ہوں فرزندِ مریم کے صفات؟

ہیں کلام اللہ کے الفاظ حادث یا قدیم
امتِ مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات؟

کیا مسلماں کے لئے کافی نہیں اس دور میں
یہ الٰہیات کے ترشے ہوئے لات و منات؟

تم اسے بیگانہ رکھو عالمِ کردار سے
تا بساطِ زندگی میں اسکے سب مہرے ہوں مات!

خیر اسی میں ہے قیامت تک رہے مومن غلام
چھوڑ کر اوروں کی خاطر یہ جہانِ بے ثبات

ہے وہی شعر و تصوف اسکے حق میں خوب تر
جو چھپا دے اسکی آنکھوں سے تماشائے حیات

ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں
ہے حقیقت جس کے دیں کی احتسابِ کائنات!

مست رکھو ذکر و فکرِ صبحگاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں سے

مطبوعات: اردو رائٹرس گلڈ۔ الہ آباد

اقبال ایک تجزیاتی مطالعہ	ساحل احمد	۸/-
غزل پس منظر پیش منظر	"	۴۰/-
شعری ادب	"	۲۰/-
ولی شخصیت، فن اور کلام	"	۱۵/-
یازدہ	"	۱۰/-
اقبال کی نظموں کا تجزیاتی مطالعہ	"	۱۵/-
ادبی تنقید	ہڈسن / عصمت جاوید	۱۰/-
وجدان	"	۱۲/-
آنگن ایک تنقیدی جائزہ	اسلم آزاد	۷/-
ریت ریت لفظ	حمید سہروردی	۱۵/-
ریت پر گرفت	رشید امجد	۱۲/-
وہ فقیر اور....	بمل کرشن اشک	۱۰/-
نئے تناظر	وزیر آغا	۳۰/-
انشار کے حریف و حلیف	عابد پشاوری	۳۵/-
حیات بیدل	ڈاکٹر امانت	۱۲/-
افسانہ حقیقت سے علامت تک	سلیم اختر	۱۶/-
فسانہ آزاد ایک تنقیدی جائزہ	تبسم کاشمیری	۱۲/-
ردہی	جمیلہ ہاشمی	۱۲/-
آنکھیں اور پاؤں	بلراج کومل	۲۰/-

پس دست: ۸۳-۱۹۸۲ء

اقبال اور غزل ۔ اوّل	ساحل احمد
مضامین ۔ اوّل	〃
اکبر الہ آبادی کی شاعری	〃
اردو کی چند مشہور کتابیں ۔ ۱	〃
اردو کی چند مشہور کتابیں ۔ ۲	〃
موسیم	〃
یگانہ شخصیت، فن اور کلام	〃
فانی بدایونی	〃
اردو افسانے میں دیہات کی پیشکش	انور سدید
میر انیس کی اقلیم سخن	〃
اردو بذریعہ ہندی	شمشاد زیدی
تنقیدی افکار	شمس الرحمان فاروقی
افسانے کا منظر نامہ	مرزا حامد بیگ
غزلیں	ناصر کاظمی
اوج ثریا	اوج یونسی
رلکے کے نوٹ	ہادی حسین
صاعقہ طور	تاج پیامی
شاخ آگہی	حرمت الاکرام

اُردو رائٹرس گلڈ، الٰہ آباد

اقبال ایک تجزیاتی مطالعہ ساحل احمد ۶/-	غزل پس منظر پیش منظر ساحل احمد ۴۰/-	شعری ادب ساحل احمد ۲۰/-
یازدہ ساحل احمد ۱۰/-	ولی شخصیت فن اور کلام ساحل احمد ۱۵/-	ادبی تنقید عصمت جاوید ۱۰/-
وجدان عصمت جاوید ۱۲/-	آنگن ایک تنقیدی جائزہ اسلم آزاد ۷/-	انشا کے حریف و حلیف عابد پیشاوری ۳۵/-
نئے تناظر وزیر آغا ۳۰/-	حیات بیدل ڈاکٹر امانت ۱۲/-	وہ فقیر اور.... بمل کرشن اشک ۱۰/-
فسانۂ آزاد ایک تنقیدی جائزہ تبسم کاشمیری ۱۲/-	افسانہ حقیقت سے علامت تک سلیم اختر ۱۶/-	ریت ریت لفظ حمید سہروردی ۱۵/-
ریت پر گرفت رشید امجد ۱۲/-	روہی جمیلہ ہاشمی ۱۲/-	رلکے کے نوحے ہادی حسین ۱۶/-
یگانہ شخصیت فن اور کلام ساحل احمد ۱۸/-	اقبال کی نظموں کا تجزیاتی مطالعہ ساحل احمد ۱۸/-	فانی بدایونی ساحل احمد ۲۵/-

URDU WRITERS' GUILD

ALLAHABAD